ماہنامہ
گوجرانوالہ

فلاحِ آدمیت

Reg: CPL No. 80

FEBRUARY 2008

فروری
2008

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا

صداقت
اللہ
محبت

سِلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پروازِ مسلسل

☆ موجودہ دور کے عظیم صوفی اور بانی سلسلہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی تعلیم کا علمبردار۔

☆ رُہبانیت اور شرک سے پاک اور قرآن وسنت کے عین مطابق راہ فقر کی تعلیم کا داعی۔

☆ وحدتِ اُمت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا ترجمان۔

☆ فرقہ واریت، غصہ اور نفرت ختم کر کے عالمگیر محبت اپنانے کا نقیب۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

منشور دعوت

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً
وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ
وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغٰفِلِيْنَ ط

الاعراف۔ 205

ترجمہ

اپنے رب کو اپنے دِل میں عاجزی اور ڈر کے
ساتھ، اُونچی آواز نکالے بغیر، صبح وشام
یاد کرو۔ اور غافلوں میں سے نہ ہونا۔

ماہنامہ

گوجرانوالہ

آدمیت سے فلاح

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاری رح

بانی سلسلہ

نگران وسرپرست

محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ
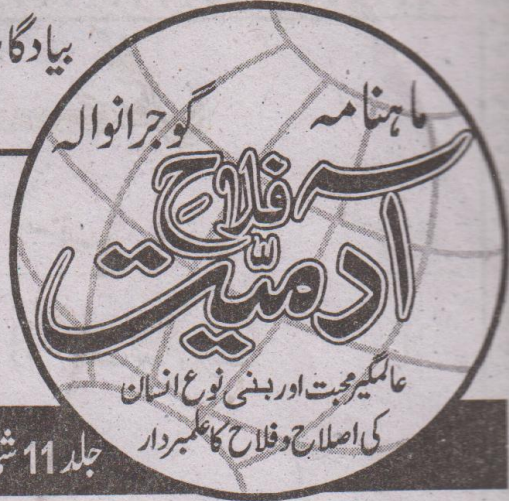
جلد 11 شمارہ 5 فروری 2008ء محرم 1429ھ

ایڈیٹر وحید احمد

سرکولیشن مینجر میاں علی رضا

قیمت ——— -/20 روپے

سالانہ فنڈ ——— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:

محمد صدیق ڈار توحیدی

مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ

Ph:055-3862835

Mob: 0300-6493335

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:

وحید احمد

تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

Ph:055-3881379

Mob:0300-7409533

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020

E-mail: info@toheedia.net

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

درس قرآن

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ)

یونس

نام

سیدنا یونس علیہ السلام اور آپ کی قوم کے تذکرے کی وجہ سے اس سورۃ کا علامتی نام "یونس" رکھا گیا۔

زمانہ نزول

یہ مکی سورت ہے۔ یہ سورۃ اپنے مضامین کے اعتبار سے صراحتاً دلالت کرتی ہے کہ اس کا نزول ہجرت سے قبل مکی زندگی کے آخری دور میں ہوا۔ کیونکہ سورۃ کا مرکزی خیال منکرین و معاندین کو یہ بات بتلانا ہے کہ اگر قبولیت حق کی استعداد تم سے سلب ہو چکی ہے اور تم حیلوں بہانوں سے دعوت حق ٹھکرانے کا فیصلہ کر چکے ہو اور تلقین حق اور فریضۂ رسالت کی ادائیگی اب تمہیں ناگوار ہی نہیں گزرتی بلکہ تم اپنے آپ کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو اس سلسلے میں پہلے انبیاء کے مخالفوں کے انجام پر غور کرو کہ ان کے اس انتہائی اقدام کا نتیجہ کیا نکلا؟

مضامین

پہلی مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی دو مضامین کو بطور خاص بیان کیا گیا ہے:۔

ا۔عقیدۂ توحید۔

ب۔موت کے بعد کی زندگی اور جزا و سزا۔

اس سورۃ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عقیدۂ توحید مدلل انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اس کیلئے ایسے دلائل بیان کئے گئے ہیں جو تعصب سے پاک انسانوں کو جاہلانہ طور طریقوں سے نکال سکیں نیز ایسے لوگوں کو ان کی غلط فہمیوں اور غفلتوں پر بھی متنبہ کیا گیا کیونکہ کفار مکہ حیات بعد موت کے قائل نہ تھے۔ ان کو بتایا گیا کہ موجودہ زندگی امتحان کیلئے مہلت کا دور ہے یہ مہلت انتہائی قلیل اور مختصر بھی ہے اور اس کے بعد مزید کوئی مہلت یا موقع دوبارہ میسر نہ آسکے گا، اس لئے اس زندگی سے بھرپور فائدہ اٹھا کر حقیقی زندگی (جو موت کے بعد شروع ہونے والی ہے) کو بہتر بنانے کی فکر کرو۔

اسی طرح کفار قریش نبی اکرم ﷺ کی رسالت کی بابت شکوک و شبہات کا شکار تھے۔ان کے شکوک کا بھی ازالہ کیا گیا کیونکہ اس علاقہ میں عرصہ دراز سے کوئی نبی نہ آیا تھا، اس لئے ان لوگوں نے آسمانی ہدایت و رہنمائی کے بغیر ہی من گھڑت رسومات کو بطور مذہب اپنا لیا تھا۔اس گمراہی اور دیگر جاہلانہ رسوم کے انجام بد کو ظاہر کرنے کیلئے سابقہ اُمتوں میں سے نوحؑ اور موسیٰؑ کی اُمتوں کے حالات کو بطور شہادت و تمثیل پیش کیا تا کہ یہ بات اہل مکہ پر واضح ہو جائے کہ سیدنا محمد ﷺ بھی اسی رب کے بھیجے ہوئے نبی و رسول ہیں جس نے نوح و موسیٰ علیہما السلام کو مبعوث فرمایا۔وہ جب چاہے گا، تمہاری بساطِ حیات کو اسی طرح لپیٹ دے گا جیسے ان دونوں اقوام کے ساتھ ہوا۔پھر اس نزع میں نہ تمہاری توبہ قبول کی جائے گی اور نہ تمہارا ایمان معتبر ہوگا۔نیز اُمتِ مسلمہ کے مظلوم اور ستائے ہوئے افراد کو تسلی دی کہ صرف مظلومیت ہی تمہارا مقدر نہیں بلکہ بہت جلد اللہ تعالیٰ اس حالت کو تبدیل کر دے گا لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جو تعلیماتِ الٰہی تم تک پہنچ چکی ہیں، ان میں ترمیم و تبدیلی نہ اب ہو سکتی ہے، نہ آئندہ قیامت تک ہو سکے گی۔اس لئے اقتدار اور غلبہ ملنے کے بعد اگر اس اُمت کے افراد بھی بہک گئے تو ان کا انجام پہلے لوگوں سے مختلف نہ ہوگا۔

تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الر تلك ايت الكتب الحكيم٥

اكان للناس عجبا ان اوحينا الى رجل منهم ان انذر الناس و بشر الذين امنوا ان لهم قدم صدق عند ربهم قال الكفرون ان هذا لسحر مبين٥

''یہ بڑی دانائی والی کتاب کی آیتیں ہیں۔کیا لوگوں کو (اس پر) تعجب ہوا کہ ہم نے انہی میں سے ایک مرد کو حکم (دے کر) بھیجا کہ (نافرمان) لوگوں کو ڈرسنائے اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے کہ (ایمان والوں کیلئے) ان کے رب کے ہاں اس کا سچا درجہ ہے۔(ایسے شخص کی نسبت) کافر کہتے ہیں کہ یہ تو (کھلا) صریح جادوگر ہے''۔(یونس:21)

سورۃ یونس کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے۔اور اس کے بعد قرآن مجید کی حکمت والی کتاب ہونے کا ذکر ہے۔ابتدائے سورۃ میں مشرکین کے تعجب کا ذکر ہے۔انہیں اس بات پر

تعجب تھا کہ ہماری ہی قوم کا ایک فرد جو نسلِ انسانی ہی سے ہے، وہ منصبِ نبوت و رسالت پر فائز ہو گیا ہے اور اس کی تعلیم ان کے موروثی نظریات کے بالکل برعکس ہے۔

ہماری منزل ذاتِ الٰہی ہے

اس تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ کی واحدانیت پر آفاق کے وجود کو بطور دلیل پیش کیا اور فرمایا کہ اس نے کائنات کی تخلیق کے بعد اس کو چلانے کا اہتمام اور اس کی تدبیر و انتظام بھی خود ہی سنبھال رکھا ہے۔ اس کے بعد وہ آیات ہیں جن کا موضوع اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے متعلق ہے کیونکہ انسان کی زندگی کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی ملاقات، اس کا دیدار اور اس کا قرب ہے۔ ہم ذرا سا نقصان ہو جانے پر یہی کہتے ہیں:۔

انا للّٰه وانا اليه راجعونo

''ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں''۔

اس عقیدے کی وضاحت کیلئے زمین و آسمان، سورج چاند کی منازل کا تعین اور دنوں برسوں کی گنتی، رات دن کے اختلاف کو بطور دلیل ذکر کیا اور غافل دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کیلئے فرمایا:۔

ان الذين لا يرجون لقاء نا و رضوا بالحيوة الدنيا واطمانوا بها والذين هم عن ايتنا غفلونo
اُولئك ماوهم النار بما كانوا يكسبونo

''بے شک (وہ لوگ) جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں اور (وہ) دنیا کی زندگی سے خوش اور اس پر مطمئن ہو بیٹھے (ہیں) اور ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، ان ٹھکانہ ان کے (اعمال) کے سبب جو وہ کرتے ہیں، دوزخ ہے''۔ (یونس: 7-8)

گویا دنیا کی غفلت کا انجام آخرت میں انتہائی ہولناک ہوگا۔ جبکہ اہل ایمان دنیا اور آخرت میں ہر جگہ ہر حال میں اپنے رب کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا ہر سفر تو اپنے رب ہی کی جانب ہے۔

انہی غافل لوگوں کی دنیوی حالت یہ ہے کہ جب انہیں کوئی دکھ پہنچتا ہے یا کسی اذیت کا شکار ہوتے ہیں تو اُٹھتے بیٹھتے ہر حال میں اللہ ہی سے استعانت کرتے ہیں اور جونہی یہ اذیت ناک لمحے گزر جاتے ہیں وہ پھر اسی فریب زدہ زندگی میں پلٹ جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ ایسے لوگوں کو عرصہ دراز تک بار بار آزمائشوں میں ڈال کر پرکھتا ہے۔ جبکہ وہ کافر اپنے اعمال

کی ظاہری زیب وزینت کے باعث خودفریبی کا شکار رہتے ہیں۔اور پھر یکبارگی ان غافل لوگوں کو ہلاک کردیا جاتا ہے۔

كذلك زين للمسرفين ما كانوا يعملون o ولقد اهلكنا القرون من قبلكم لما ظلموا o

''اسی طرح حد سے نکل جانے والوں کو ان کے اعمال آراستہ کر کے دکھائے گئے ہیں (اور جب وہ اس ظاہری شان وشوکت میں اُلجھ گئے تو) ہم نے ان کے ظلم کے باعث ان کو ہلاک کر دیا''۔ (یونس 12-13)

لیکن اس مقام پر ایک بات بہت ہی خوبصورت فرمائی گئی کہ ہم انہیں متنبہ کرنے کیلئے ان کے ہاں رسول ضرور بھیجتے رہے اور یہ سلسلہ تا ہنوز (بعثت خاتم الانبیاء تک) جاری ہے۔اور ہم نے ان کے پیچھے تم کو ان کا نائب بنایا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے:۔

لننظر كيف تعملونo ''تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو''۔(یونس :14)

نبوتِ محمدی پر دلیل قاطع

کفارِ مکہ کی ایک کٹ حجتی کو یہاں بیان کیا گیا ہے۔اس سے قبل یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔اورنزاعی و اختلافی مسائل و معاملات میں بحیثیت مسلمان ہمارا کیا نقطۂ نظر ہونا چاہئے؟

ارشادِباری تعالیٰ ہے:۔

واذ ا تتلى عليهم اياتنا بينت قال الذين لا يرجون لقاء نا ائت بقران غير هذا اوبدله ـ قل ما يكون لى ان ابدله من تلقاى نفسى ان اتبع الا ما يوحى الى انى اخاف ان عصيت ربى عذاب يوم عظيمo

قل لوشاء الله ماتلوته عليكم ولا ادركم به فقد لبثت فيكم عمرا من قبله افلا تعقلونo

فمن اظلم ممن افترى على الله كذبًا او كذب بايته انه لا يفلح المجرمونo

''اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی اُمید نہیں،

وہ کہتے ہیں کہ (یا تو) اس کے سوا کوئی اور قرآن (بنا) لاؤ، یا اس کو بدل دو۔ (آپ ﷺ کو اس موقع پر حقیقت پسندانہ رویہ اپنانے کی تلقین ان الفاظ میں کی جارہی ہے کہ) کہہ دیجئے! مجھ کو اختیار نہیں کہ میں اس کو اپنی طرف سے بدل دوں۔ (کیونکہ) میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے (سخت) دن کے عذاب سے خوف آتا ہے۔ (یوں بھی) کہہ دیجئے کہ اگر اللہ چاہتا تو (نہ تو) میں ہی یہ (کتاب) تم کو پڑھ کر سناتا اور نہ وہی تمہیں اس سے واقف کرتا۔ میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر رہ چکا ہوں (اور کبھی ایک کلمہ بھی اس طرح کا میں نے نہیں کہا جس میں کسی قسم کا دعویٰ ہو یا جھوٹ کا شائبہ ہو) بھلا تم (یہ) سمجھتے نہیں۔ (مزید تاکید اور وضاحت کیلئے یوں ان کو حقیقت حال واضح کریں کہ) اس سے بڑھ کر ظالم کون (ہے) جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور اس کی آیتوں کو جھٹلائے۔ بے شک گنہگار کامیاب نہ ہوں گے''۔ (یونس15-17)

توحید فطرتِ انسانی ہے

اس کے بعد انسانی فطرت و جبلت کا ذکر کیا کہ توحید کا سبق تو انسان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ مگر انسان اپنی مکاری کے باعث حیلے اور سازشیں کرتا رہتا ہے۔

واذا اذقنا الناس رحمة من بعدضراء مستهم اذا لهم مكر فى اياتنا قل الله اسرع مكرا۔ ان رسلنا يكتبون ما تمكرونo

''اور جب ہم لوگوں کو تکلیف پہنچنے کے بعد (اپنی) رحمت (سے آسائش) کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ ہماری آیتوں میں حیلے کرنے لگتے ہیں۔ کہہ دو کہ اللہ بہت جلد حیلہ (کی سزا کا فیصلہ) کرنے والا ہے۔ بے شک جو تم (حیلے) کرتے ہو، ہمارے فرشتے ان کو لکھتے ہیں''۔ (یونس:21)

اس کے بعد انسانی حیلوں کا ایک انداز بتایا کہ سمندری سفر کے دوران میں سازگار ہواؤں کے بعد جب طوفانی موج کے باعث کشتی ڈگمگانے لگتی ہے تو یہ اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور طوفانی تھپیڑوں سے نکلتے ہی وہ گمراہی و ضلالت کی وادیوں میں بھٹکنے لگتے ہیں۔ بالکل اسی طرح انسانی زندگی اور اس کے اعمال جب تک اللہ کے حکم کے تحت ہوتے ہیں، مفید اور کارآمد ہوتے ہیں مگر جب یہ نفسانی خیالات کے تابع ہو جاتے ہیں تو وہ اعمال خود اس انسان اور دوسرے لوگوں

کیلئے وبال اور عذاب کا باعث بن جاتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

واللّٰہ یدعوا الی دارالسلم ۔ و یھدی من یشاء الی صراط مستقیمo

''اور سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، سیدھا راستہ دکھاتا ہے''۔

(یونس:25)

جو شخص اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے راہِ مستقیم پر چل نکلتا ہے ایسے لوگوں کیلئے یہ انعام ہے کہ ان کے چہرے ذِلت و رسوائی اور لعنت اور پھٹکار کی سیاہی سے محفوظ ہوں گے۔ اور جن لوگوں نے اس راہ کو چھوڑ دیا ہے، ان کے چہروں پر رات کی تاریکی کی مانند سیاہی ہوگی اور اس موقع پر یعنی میدانِ حشر میں مشرکوں کو کس طرح ذِلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس کو یوں بیان فرمایا:۔

و یوم نحشرھم جمیعا ثم نقول للذین اشرکوا مکانکم انتم و شرکاؤکم فزینا بینھم و قال شرکاؤھم ما کنتم ایانا تعبدونo

فکفی باللّٰہ شھیدًا بیننا و بینکم ان کنا عن عبادتکم لغفلینo

ھنالک تبلوا کل نفس ما اسلفت وردوا الی اللّٰہ مولھم الحق وضل عنھم ما کانوا یفترون o

''اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، (اس دن مشرکوں) کو ہم کہیں گے کہ تم اور تمہارے شریک (جن کو تم پوجتے رہے) اپنی اپنی جگہ ٹھہرے رہو تو ہم ان میں تفرقہ ڈال (کر جدا جدا کر) دیں گے۔ (اور پھر ان کے معبودوں سے پوچھیں گے کہ تم نے ان سے اپنی عبادت کیوں کرائی ؟) تو ان کے شریک (ان سے) کہیں گے کہ تم ہم کو نہیں پوجا کرتے تھے۔ (اس بات کے ثبوت کیلئے) ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ ہی گواہ کافی ہے۔ (کہ) ہم تمہاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔ وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے، آزمائش کر لے گا اور (وہ جان لیں گے کہ) وہ اپنے سچے مالک کی طرف لوٹا دیے گئے ہیں۔ اور (دنیا میں) جو وہ بہتان باندھا کرتے تھے (جھوٹے معبودوں کا اقرار کرتے ہوئے) سب ان سے گم ہو جائے گا''۔ (یونس:28-30)

اسلام میں سلام کی اہمیت

(امتیاز احمد)

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے۔(الحشر:23)

ھواللّٰہ الذی لا الہ الا ھو الملک القدوس السلم المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر سبحن اللّٰہ عما یشرکون○

(ترجمہ) وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔بادشاہ (حقیقی) پاک ذات (ہر عیب سے)، سالم امن دینے والا، نگہبان، غالب، زبردست، بڑائی والا۔خدا ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔

اس آیت کریمہ میں ''سلام'' اللہ کے برگزیدہ ناموں میں سے ایک نام ہے۔آیئے ہم لفظ ''سلام'' کے معنی، اہمیت اور استعمال جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظہورِ اسلام سے قبل اہل عرب آپس میں ایک دوسرے کو حیاک اللہ، یعنی اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔مذہب اسلام نے اسکی جگہ سلام کا ایک انتہائی پُر معنی طریقہ بتایا وہ یہ ہے، ''السلام علیکم'' جسکے معنی ہیں اللہ تمہیں ہر طرح کے رنج و غم، نقصان اور تکلیف سے محفوظ و مامون رکھے۔

احکام القرآن میں ابن العربی فرماتے ہیں: السلام اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک ہے، جس کا مطلب ہے ''اللہ تمہارا نگہبان''۔

مذہب اسلام میں سلام کا یہ طریقہ دنیا کے دیگر مذاہب کے تمام طریقوں سے بہتر اور بامعنی ہے جن کی مندرجہ ذیل تین وجوہات ہیں:۔

ا۔سلام صرف محبت اور خلوص کے اظہار ہی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ ایک انتہائی معقول طریقہ سے اپنے اسلامی بھائی کیلئے ایک مختصر مگر مکمل دعا بھی ہے۔سلام کرنے والا گویا خلوص دل سے دُعا کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ آپ کو سلامتی دے بلکہ آپ کو ہر دکھ، تکلیف، مصیبت، پریشانی اور ہر رنج و غم سے محفوظ و مامون رکھے۔یہ طریقہ سلام اس طریقہ سلام سے کہیں زیادہ بامعنی اور جامع ہے جو ظہورِ اسلام سے قبل اہل عرب ایک دوسرے کیلئے استعمال کرتے تھے۔

۲۔سلام کا یہ طریقہ ہمیں بار بار یاد دلاتا ہے کہ ہم ہر حالت میں اللہ کے محتاج ہیں۔اللہ کی مرضی کے بغیر نہ کوئی کسی کو فائدہ ہی پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی نقصان،اس طرح سلام ہر مسلمان کو اپنے عبداور اللہ کے معبود ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

۳۔یاد رکھئے کہ جب بھی کوئی آپ کو یا آپ کسی کو سلام کرتے ہیں تو آپ دونوں گویا اس بات کا عہد کرتے ہیں بلکہ آپ ایک طرح سے اللہ کو حاضر ناظر جان کر یہ کہتے ہیں کہ اے میرے بھائی تجھے میری زبان اور میرے ہاتھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔اور یہ عہد بھی کرتے ہیں کہ تیری زندگی اور تیری عزت اور آبرو پر بھی میری طرف سے کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

ابن العربی احکام القرآن میں فرماتے ہیں:تم جانتے ہو سلام کیا ہے؟سلام کرنے والا اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ تمہیں اسکی طرف سے کسی بھی قسم کا کوئی بھی نقصان نہیں پہنچے گا۔اس لئے ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ۔

۱۔سلام اللہ تعالٰی کا ذکر ہے اور جامع دعا بھی۔

۲۔سلام ایک یاددہانی ہے۔

۳۔سلام دو مسلمانوں کے درمیان محبت اور خلوص کا عہد ہے۔

۴۔سلام ایک عہد ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عزت وآبرو کا محافظ اور نگہبان ہے۔

حضورﷺ نے فرمایا:سچا مسلمان وہ ہے جسکی زبان اور ہاتھ سے اس کے مسلمان بھائی کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔اگر ہم مسلمان صرف اس ایک حدیث کو سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو میرا دعویٰ ہے کہ آج بھی پوری اُمتِ مسلمہ محبت اور خلوص کے اٹوٹ بندھن میں بندھ سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسولﷺ نے سلام کی عادت کو عام کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور فرمایا کہ یہ سب نیک کاموں میں سے ایک نہایت اہم نیکی ہے اس بارے میں حضورﷺ کی کئی احادیث موجود ہیں جن سے سلام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسولﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "تم اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتے جب تک کہ تم مومن(ایمان والے)نہ ہو۔اور تم ایمان والے اس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم اپنے مسلمان بھائی سے محبت اور خلوص سے پیش نہ آؤ۔آؤ آج میں تم کو ایسی بات بتاؤں جسکے عام کرنے سے تمہاری باہمی محبت میں یقیناً اضافہ ہوگا۔اور وہ

یہ ہے کہ تم جب بھی کسی مسلمان بھائی سے ملو تو اسے سلام کیا کرو، چاہے تم اسے جانتے ہو یا نہ جانتے ہو"۔ (مسلم)

عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ کسی نے اللہ کے رسول ﷺ سے پوچھا تمام اعمال میں سب سے اچھا عمل کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "۱۔ دوسروں کو کھانا کھلانا۔ ۲۔ آپس میں سلام قائم کرنا، چاہے تم ایک دوسرے کو جانتے ہو یا نہ جانتے ہو"۔ (صحیحین)

ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے اللہ کے سب سے نزدیک وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں پہل کرتا ہے"۔ (مسند احمد/ترمذی/ابوداؤد)

عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا "السلام" اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اس لئے ہمیں سلام کو عام کرنا چاہئے۔ جب کوئی کسی کو سلام کرتا ہے اور اگر کوئی اُس کا جواب نہ دے تو اُس صورت میں اللہ کے فرشتے اُس کے سلام کا جواب دیا کرتے ہیں"۔ (مسند، بزار، معجم کبیر طبرانی)

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا "صحیح معنوں میں بخیل وہ ہے جو سلام کرنے میں بخل سے کام لے"۔ (سورۃ النساء:86)

واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا او ردوھا اِن اللہ کان علی کل شی حسیباo

(ترجمہ) اور جب تم کو کوئی دعا دے (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے) سے (اسے) دعا دو یا انہیں لفظوں سے دعا دو۔ بیشک خدا ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ سلام کا جواب ویسا یا اس سے بہتر دینا چاہیے۔ مثلاً وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، سلام کا جواب نہ دینے والا گنہگار ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے سلام سے متعلق مزید وضاحت فرماتے ہوئے اُمت مسلمہ کو حکم دیا ہے کہ:۔

۱۔ سوار شخص پیدل چلنے والے کو سلام میں پہل کرے۔

۲۔ پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام میں پہل کرے۔

۳۔ چھوٹا مجمع بڑے مجمع کو سلام کرے۔

۴۔ محفل سے اٹھ کر جانے والا باقی بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرے۔

۵۔ گھر سے باہر نکلتے وقت اور داخل ہوتے وقت سلام کرے خواہ گھر میں کوئی بھی نہ ہو۔ اس سلام کا جواب فرشتے دیں گے۔

۶۔ کسی ایک ہی شخص سے جتنی بار ملاقات ہو اتنی بار سلام کرے۔

تین حالتوں میں سلام کا جواب نہ دینے کا حکم ہے۔

۱۔ نماز کی حالت میں، اگر نماز کے دوران جواب دیدیا تو نماز ٹوٹ جائے گی۔

۲۔ جب کوئی قرآن حکیم کی تلاوت کر رہا ہو، یا جب موذن اذان دے رہا ہو یا اقامت بول رہا ہو یا کوئی خطیب اسلام کا درس دے رہا ہو۔

۳۔ جب کوئی غسل یا حاجت وغیرہ میں مشغول ہو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مزید وضاحت فرمائی ہے۔ (سورۃ الانعام: 54)

واذا جاءك الذين يومنون بايتنا فقل سلم عليكم كتب ربكم على نفسه الرحمة انه من عمل منكم سوا بجهلة ثم تاب من بعده واصلح فانه غفور رحيم○

(ترجمہ) اور جب تمہارے پاس ایسے لوگ آیا کریں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو (ان سے) سلام علیکم کہا کرو۔ خدا نے اپنی ذات (پاک) پر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔ کہ جو کوئی تم میں سے نادانی سے کوئی بری حرکت کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کرلے اور نیکو کار ہو جائے تو وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو ہدایت فرما رہا ہے کہ آپ کے گرد جو غریب مسلمان جمع ہوں آپ ان کو سلام کہا کیجئے۔ کیونکہ عرب کے امیر وکبیر کفار ان قریش چاہتے تھے کہ حضور ﷺ ان غریب مسلمانوں کو اپنے پاس نہ آنے دیں۔ لیکن اللہ کے رسول ﷺ بحکم اللہ تعالیٰ ان غریبوں کو سلام کرتے تھے۔ جس سے ان کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی ہوتی تھی، علاوہ ازیں ان مفلس مگر مخلص مسلمانوں کیلئے یہ خوشخبری بھی تھی، کہ اگر یہ لوگ کوئی غلطی بھی کر بیٹھیں پھر توبہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دیں گے۔

میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے، آپ سب کو اور پوری اُمت مسلمہ کو سلام کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

مسلمان کا نصب العین

(مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی)

اللہ کو نصب العین ماننے کے بعد

الغرض نصب العین صرف اللہ ہے اور کچھ نہیں۔ اور یہی اقرارِ الوہیت والٰہیت **لا اله الا الله** اور **مالکم من اله غیره** کا مطلب ہے۔ لیکن اللہ کو نصب العین تسلیم کر لینے کے بعد لازماً ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نصب العین کے حصول یا اس تک رسائی کس طرح ہو؟ وحیِ الٰہی کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس نے نصب العین کی اس واضح تعیین کے ساتھ طریقہ حصول و رسائی بھی بیان کر دیا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان سے ایک ہی متفق علیہ پیغام دیا ہے۔ کہ **یقوم اعبدوا الله مالکم من اله غیره** اللہ کی عبدیت و غلامی اختیار کرو، اللہ کے سوا تمہارا کوئی نصب العین نہیں۔ یہاں ایک ہی جملے میں نصب العین اور اس کا طریقہ حصول و رسائی دونوں ہی بیان کر دیے گئے ہیں۔

یہ عبدیت اختیار کرنے کے بعد ہی اس کے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں جن میں کفر بالطاغوت، اجتناب طاغوت، تزکیہ، اوامر و نواہی کا لحاظ، غرض سارے احکامِ الٰہی (اپنے اپنے مواقع پر) داخل ہیں۔

یہ مقتضیاتِ عبدیت امتحانات کی بھٹیاں ہیں جن سے گذرنے کے بعد کچھ خوشگوار نتائج حاصل ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان ہی انعاموں اور صلوں کا وعدہ فرماتا ہے۔ استخلاف فی الارض اور اس کے ثمرات، نجات، جنت، رضا یا قرب وغیرہ سب انہی انعامات کی مختلف شکلیں ہیں۔

چار اجزا

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ نصب العین، اس کا طریقہ حصول، اس طریقے کے تقاضے اور ان کے انعامات و ثمرات سب کے سب الگ الگ اجزا ہیں۔ اگر چہ ایک دوسرے کے ساتھ ناقابل انفکاک طور پر وابستہ و پیوستہ بھی ہیں۔ لیکن ایک کو دوسرے میں خلط ملط کرنا صحیح نہیں۔ شکل، رنگت، خوشبو اور خاصیت سب ایک ہی پھول سے وابستہ ہیں۔ لیکن شکل کو خاصیت، خاصیت کو

خوشبو، خوشبو کو رنگ اور رنگ کو شکل قرار دینا صحیح نہیں ۔جڑ، تنا، شاخیں، پتے، پھول اور پھل سب ایک ہی درخت سے وابستہ ہیں ۔لیکن ان میں سے کوئی ایک چیز بھی درخت نہیں کہی جائے گی۔ یہ چار موٹے موٹے اجزا ہم نے سرسری طور پر تجویز کیے ہیں ۔جن میں آپ کمی بیشی بھی کر سکتے ہیں۔ ہماری غرض تو صرف یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کا صحیح مقام دیا جائے اور کسی مقام کے تعین میں غلط ملط نہ ہو۔

نتیجہ

حکومت الٰہیہ یا خلافت ارض نصب العین نہیں ۔ بلکہ نصب العین کے طریقہ حصول (عبدیت) کے ہزار انعامات میں سے ایک انعام اور ایک صلہ ہے اور اسی صلے کا اللہ کی طرف سے یوں وعدہ ہے کہ **وعد اللّٰہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض** الخ ۔نجات یا قرب و رضا وغیرہ بھی انعام یا نتیجہ و ثمرہ ہے اصل نصب العین کی عبدیت کا۔انسان کی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر سرفرازی حاصل کرنا اور منازل ارتقا طے کرنا بھی ایک خوشگوار نتیجہ ہے نہ کہ نصب العین ۔ان تمام خوشگوار نتائج و ثمرات سے پہلے اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دینا تقاضا ہے ۔عبدیت کا نہ کہ خود نصب العین ہے ۔عبدیت کا اختیار کرنا بھی ایک واحد ذریعہ و طریقہ ہے حصول نصب العین کا بذاتِ خود نصب العین نہیں ۔

ایک آیت پر غور

اس آیت پر ذرا غور و تدبر فرمائیے **قل ان صلوٰتی و نسکی ومحیای و مماتی للّٰہ رب العالمین** ،اس آیت میں زندگی کی تمام بنیادی اور اہم حرکت و سکون کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے ۔لیکن کس مقصد (نصب العین) کیلئے لِلّٰہ ۔اللہ کیلئے ۔ان تمام گردشوں کا محور ایک ہی ہے اللہ ۔آیت میں للّٰہ ہے ۔**لا قامة الدین** نہیں ۔**لقیام الحکومته الا لھیة** بھی نہیں ۔**لالا ستخلاف فی الارض لتنفیذ قوانین القران ، لطی منازل الا رتقاء الا نسانیة حتیٰ** کہ **النجوة**۔اور **لرضاء اللّٰہ** بھی نہیں صرف لِلّٰہ ہے ۔اگر اللہ کی راہ میں یعنی فی سبیل اللہ کچھ ہوگا تو وہ عبدیت یا اس کا تقاضا ہوگا "اللہ" نہ ہوگا

کیونکہ نصب العین اس کے سوا کچھ بھی نہیں اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ طریقہ حصول نصب العین یعنی عبدیت ہے یا تقاضائے عبدیت یا ثمرہ عبدیت ہے (یعنی صلہ و انعام عبدیت) ہمارا مقصود صلہ نہیں صاحب صلہ یا واہب صلہ ہے۔ انعام ہمارا نصب العین نہیں بلکہ خود منعم ہے۔ حکومتِ اسلامیہ یا ریاست الٰہیہ نہیں بلکہ وہ ذات ہے جس تک رسائی کے ذریعوں میں سے ایک ذریعہ یا جس کے انعامات میں سے ایک انعام یہ بھی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی موقعے پر یہ بھی نظام حکومت قائم کرنے کی بجائے دنیا سے کٹ کر اپنے ایمان کو سلامت رکھنے کے لئے اصحابِ کہف کی طرح گوشہ انزوا اختیار کرنا ہی عین تقاضائے عبدیت ہو۔

ایک لمحہ فکریہ

کیا رسول اکرم ﷺ نے پوری زندگی۔۔۔مکی زندگی۔۔۔میں کبھی اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کی دعوت دی ہے اور ایمان لانے والے اسی کو نصب العین سمجھ کر ایمان لائے ہیں۔ کیا اس کا کوئی اشارہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ میں ملتا ہے؟ پھر کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم ایک ایسی حقیقت کو اپنا نصب العین قرار دیں جس کی طرف مکے کی 13 سالہ زندگی میں حضورؐ نے اشارہ نہ کیا، اس قسم کی دعوت میں تو خدا کے نام پر خود اقتدار حکومت حاصل کرنے کی بو بھی آ سکتی ہے اور اللہ کا نصب العین قرار دینے والا تو اتنی رمق بھی اپنے اندر باقی رکھنا پسند نہیں کرسکتا۔ نظام حکومت اسلامیہ وغیرہ تو ایک انعام الٰہی ہے جو خود بخود آ تا ہے یہ نصب العین بتائے جانے کی چیز ہی نہیں۔ دولت و ثروت بھی ایک انعام الٰہی ہے لیکن اسے نصب العین تو نہیں کہہ سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضورؐ نے اپنی پوری زندگی میں خواہ وہ مکی ہو یا مدنی کبھی قیام حکومت کو اپنا نصب العین بنا کر نہیں پیش فرمایا۔ بلکہ کسی پیغمبر نے کبھی یہ اعلان نہیں کیا کہ اے لوگو! میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں، تم اس میں ہمارا ساتھ دو۔

دوسرے اعلیٰ مقاصد

اسی طرح رضائے الٰہی بھی نصب العین نہیں۔ نصب العین تو صرف وہ ذات صمدانی ہے جس کی بارگاہِ صمدیت سے رضا کے پروانے تقسیم ہوتے ہیں۔ رضا، قرب، معرفت، فنائیت، معیت

وغیرہ یہ سب دراصل وہ باہم متقارب راستے ہیں جو اصل نصب العین تک چلے جاتے ہیں۔ اور کیا عجب کہ **والذین جاھدوا فینالنھدینھم سبلنا** میں **سبلنا** (راستوں سے) مراد یہی راستے ہوں۔ فٹ بال کا میچ آپ نے دیکھا ہوگا۔ ہر ٹیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسری ٹیم کو جتنے گول سے ممکن ہو شکست دی جائے۔ گول سے ہرانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فٹ بال کو جائز طریقے سے ایک معین طول وعرض کے درمیان سے گذرا دیا جائے۔ عموماً اس کیلئے کک (Kick) لگانی پڑتی ہے (Kick) خواہ سنٹر سے ہو یا ونگ (Wing) سے یا کارنر (Corner) سے کیری (Carry) یا پشنگ (Pushing) کر کے ہو یا پاسنگ (Passing) کر کے ہو جس طرح بھی ہو فٹ بال کو متعین چو کھٹے کے اندر سے (حدود مقابلہ سے متجاوز ہوئے بغیر) گذار دیا جائے۔ یہ سب طریقے اور راستے ہیں گول کرنے کے لیکن خود گول نہیں۔ گول یا مقصد فٹ بال کو مخصوص حلقے کے اندر سے گزار دینا ہے۔ پس اللہ کی رضا چاہی جائے یا قرب یا معیت، یا معرفت، یا فنائیت یا کچھ اور، یہ سب مختلف "اذواق" کی سبل (راستے) ہیں۔ مقصد و نصب العین صرف وہ ذات ہے جس کا قرب یا جسکی معیت یا جس کی رضا، یا جس کا عرفان یا جسمیں فنائیت مطلوب ہے۔ "**فاسلکی سبل ربك ذللا**" کو بھی اگر سامنے رکھ لیا جائے تو شاید "**لنھدینھم سبلنا**" کا مفہوم کچھ اور زیادہ واضح ہو سکے۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

یہ سوال اکثر ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ نصب العین، ذریعہ حصول، اس کے تقاضے اور اس کے نتیجے میں کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں۔ غرض تو سب کی ایک ہی ہے کہ نیک عمل ہوں، دنیا میں امن رہے۔ انجام اچھا ہو وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا ان علمی موشگافیوں کی کیا ضرورت ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اس دور میں عمل کم اور علمی موشگافیاں زیادہ ہوگئی ہیں۔ بایں ہمہ نصب العین کی تعین میں بال برابر بھی بل آ جائے تو آگے چل کر میلوں اور فرسخوں کا فرق پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہر سمجھدار مسلمان اپنا صحیح نصب العین اگر متعین کر لے تو کوئی ایسی بری بات نہیں ہوگی جس پر موشگافی کا اعتراض ضروری ہو۔ اگر کوئی شخص گلاب کی شکل یا رنگت کو مقصد بنائے تو اسے گلاب کی خوشبو یا خاصیت

سے کوئی بحث نہ ہوگی۔وہ کاغذ کے پھول سے بھی وہی کام لے لے گا جو قدرتی گلاب سے لیا جاتا ہے کیونکہ اس کا مقصد کاغذی گلاب سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔اسی طرح اگر کسی کا مقصد محض بوئے گل ہو تو اسے اس کے مجموعی شکل و رنگ وغیرہ سے کوئی غرض نہ ہوگی۔برگہائے گل کو بکھیر کر مل کر اور تلوں میں بسانے کیلئے اس کی رنگت و شکل کو بگاڑ کر بھی اپنا مقصد پورا کرے گا۔یونہی جسکا مقصد صرف خاصیت ہو وہ اس کا رنگ و شکل کو بگاڑ کر بھی اپنا مقصد پورا کرے گا۔یونہی جسکا مقصد صرف خاصیت ہو وہ اس کا رنگ، شکل، خوشبو سب کو ختم کر کے گلقند تیار کر لے گا۔لیکن جس کا مقصد یہ اجزا نہ ہوں بلکہ خود پھول ہو اس کے پاس پھول اپنے تمام اجزا سمیت ہوگا۔۔۔۔یہ ہے وہ فرق جو نصب العین کی تعیین کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔مثالیں عالم محسوسات میں بھی چاروں پاؤں پر نہیں چلا کرتیں چہ جائیکہ ورا عالمدرکات دنیا میں۔وہاں تو **لیس کمثلہ شیٔ** کی ایسی قدغن کھڑی ہے جسے طائر قیاس و خیال بھی عبور نہیں کر سکتا۔تاہم سمجھانے کیلئے کوئی محسوسات ہی کی مثال دی جاتی ہے۔مثالوں میں یا خود اظہار فی الضمیر میں کوئی سقم نظر آئے تو اسے خود ٹھیک کر لیجیے۔۔۔۔آج اللہ۔۔۔۔فقط اللہ۔۔۔۔کے سوا جن ''نصب العینوں'' کے چرچے ہیں ان میں بہت کچھ ہم نوائی و ہم رنگی پائی جاتی ہے۔جس لیڈر، جس مولوی، جس مفکر، جس شاعر، جس ایڈیٹر جس عامی سے دریافت کیجیے وہ اسلام، قرآن، حکومتِ الٰہیہ، دین، خلافتِ ربانی، قانونِ آسمانی کے الفاظ کو صفِ اول میں جگہ دے گا۔مگر اس کے باوجود سب باہم دست و گریباں ہیں۔اس کی وجوہ و اسباب ایک نہیں مختلف ہیں۔میرا موقف اس وقت ان تمام اسباب کا تجزیہ کرنا نہیں۔اس وقت جس خاص ''سبب'' کو بتانا ہے وہ اسی قدر ہے کہ وحدتِ اُمت کے لئے وحدتِ خیال ضروری ہے اور وحدتِ خیال صرف وحدتِ نصب العین سے ہو سکتی ہے اور نصب العین وہی ہو سکتا ہے جو خود نا قابل انقسام وحدت اور غیر متغیر حقیقت ہو۔ذرائع و وسائل، تقاضے اور نتائج سب ہی اپنی شکلیں بدل سکتے ہیں اور اس تبدل و تغیر کے باوجود وسائل وسائل ہی رہیں گے، تقاضے تقاضے ہی رہ جائیں گے اور نتائج نتائج ہی ہوں گے۔اگر ان میں سے کسی شے کو نصب العین بنا لیا گیا تو ہر تغیر ایک نیا نصب العین بن کر کچھ نئے پرستاروں کا گروہ الگ پیدا

کرے گا اور **کان الناس امۃ واحدۃ** کا آ بگینہ گروہوں کے اپنی ہی تصادم سے ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ جس طرح آج تک ہوتا رہا ہے۔ لیکن نصب العین اور صحیح نصب العین ۔۔۔۔ اللہ ۔۔۔۔ اپنے اندر کوئی تصادم اور کوئی تغیر نہیں رکھتا۔ اس لئے اس نصب العین کے پرستاروں میں تفرق و تحزب اور انقسام کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نصب العین کے بال برابر بھی نیچے اُتر آیئے تو اصل مرکز سے اتنی دوری ہو جائے گی جو آگے چل کر اللہ ہی جانے کہاں سے کہاں لے جا کر ڈال دے گی اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو اللہ کے آگے اور کوئی نصب العین تلاش کیا جائے جو عقلاً، وحیاً، وجداناً، ایماناً ہر طرح ناممکن ہے۔ یا پھر اسی کو نصب العین قرار دے کر اس سے نیچے کے تمام جزئی ''نصب العینوں'' کو ختم کر دیا جائے جو ہم اسلام لانے والوں سے **ادخلوا فی السلم کافۃ** کہہ کر پورے اسلام کا مطالبہ کرتے ہیں تو نصب العین کی کسی ایک دو صفت کو نصب العین قرار دینا کس حد تک درست ہو سکتا ہے؟

غلط فہمی کا سبب

یہ مغالطے غالباً اسی لیے پیدا ہوئے ہیں کہ لفظ اللہ کا مفہوم کلی نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ اپنی اپنی پسند یا پرواز کے مطابق کوئی ایک جزئی مفہوم لے کر کل کو اس میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ گویا مابعد نصب العین میں ہم جس غلطی سے لوگوں کو بچانا چاہتے ہیں اسی غلطی کا ارتکاب بنیادی حقیقت یعنی خود نصب العین کے معاملے میں خود ہم سے ہو رہا ہے۔ اگر ہم کسی ملازم سے کہیں کہ ''ہمیں بوتل چاہیے'' تو دور کے سننے والوں میں ''میخوار'' شراب کی بوتل سمجھے گا۔ مریض دوا کی بوتل خیال کرے گا، پیاسا سوڈے لی لیمونیڈ یا شربت کی بوتل تصور کرے گا۔ سردی کا مارا گرم پانی کی بوتل یقین کرے گا۔ حالانکہ ہمارا مقصود محض خالی بوتل ہے جس کے اندر کچھ نہ ہو۔ سوچنے والے اس خالی بوتل کو جو جو کچھ بھی سمجھیں گے وہ درحقیقت اپنی اندرونی کیفیات اور تحت الشعور سے اُبھرنے والے جذبات ہوں گے اور ان ہی تصورات کی بنیاد پر ہر ایک اپنی اپنی پوری عمارت ''تاثر'' تعمیر کر لے گا۔ بنیاد ہر ایک کی بوتل ہی بنے گی۔ لیکن اس بنیاد پر تعمیر ہونے والی ذہنی عمارت کہیں میخانہ ہوگی اور کہیں دواخانہ، کہیں ہوٹل ہوگی اور کہیں آتش کدہ، کیا عجب کہ لفظ اللہ

کے ساتھ بھی ایسی ہی قیاسی ستم ظریفیاں ہوئی ہوں اور زے کل کو کسی جز سے پر کرنے کی کوشش کی گئی ہو اور اس پر لیبل کلیت ہی کا چسپاں کر دیا گیا ہو۔

غور طلب

مضمون بڑھتا جا رہا ہے اور ابھی کئی گوشے تشنہ رہ گئے ہیں۔ان میں سے چند باتوں پر غور و فکر کیجئے شاید **لا الہ الا اللّٰہ** کا اور بہتر مطلب واضح ہو سکے۔

(۱) کیا واقعی اللہ کے سوا کوئی اور چیز نصب العین بن سکتی ہے جس پر نصب العین کی تمام شرطیں پوری اُتریں؟

(۲) کیا الٰہ کا مفہوم نصب العین کے سوا کسی اور دوسرے ایسے لفظ سے واضح ہو سکتا ہے جو اس کی کلیت و جامعیت کو برقرار رکھے اور ''اللہ'' پر پوری طرح چسپاں بھی ہو جائے۔

(۳) کیا قرآن پاک میں ''محض نصب العین کی حیثیت سے'' اللہ کے سوا کسی دوسرے بلند سے بلند مقصد کو پیش کیا گیا ہے؟

(۴) کیا اللہ کو ''نصب العین'' اور الٰہ کو ''بمعنی نصب العین'' تسلیم کرنے میں کوئی ایسا سقم نظر آتا ہے جو آپ کی ذہنی پستی کا سبب ہو یا اس کے برعکس آپ کو اور بلندی کی طرف لے جاتا ہے؟

(۵) جب تک ہمیں الٰہ کا مفہوم ادا کرنے کیلئے ''نصب العین'' سے اور زیادہ بہتر لفظ نہ ملے اس وقت تک اسے اختیار کیے رہنے میں کیا کوئی ایسی خرابی ہے جو دوسرے ترجموں میں پیدا ہوتی ہے؟

> خوب یاد رکھو کہ معاملات و اخلاق کی جو حدود اللہ نے مقرر کر دی ہیں اور جو طریقے کاربراری کے بتا دیئے ہیں ان پر پوری سرگرمی اور تن دہی سے عمل کرنا بھی بالکل اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز، روزہ، حج و زکوۃ وغیرہ۔یہ نہیں ہو سکتا کہ تم قرآن کی بعض باتوں پر عمل کرو اور بعض پر نہ کرو۔
> (تعمیر ملت۔263)

دینی جماعتوں کے اختلافات۔۔ یہ فرقہ بندیاں

(ثروت جمال اصمعی)

آخر کیا وجہ ہے کہ دینی جماعتوں کے سالانہ اجتماعات میں اگرچہ کئی کئی لاکھ افراد شریک ہوتے ہیں لیکن معاشرے سے دینی قدریں مٹتی چلی جارہی ہیں۔حرام وحلال کا امتیاز اُٹھ گیا ہے۔ رشوت کا لین دین اب سرے سے برائی ہی تصور نہیں کیا جاتا۔حجاب کی پابندی اب دیندار گھرانوں میں بھی کم سے کم ہوتی چلی جارہی ہے۔شادی بیاہ کے موقع پر مخلوط محفل کا رواج عام ہو گیا ہے۔دینی طاقتوں کی مزاحمت کی قوت اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ ذرائع ابلاغ سے جس قسم کی چیزیں پیش کرنے کے بارے میں پہلے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اب وہ سب کچھ دن رات پورے دھوم دھڑ کے سے ہورہا ہے اور کہیں کوئی احتجاج نہیں۔پہلے جس فیملی پلاننگ کو حرام کہا جاتا تھا اب اس کے صریحاً فحش اشتہارات دھڑلے سے ٹی وی پر آرہے ہیں۔اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔مگر ہاتھوں میں جنبش کا کیا سوال۔کسی کی زبان پر کوئی حرفِ شکایت بھی نہیں آتا۔ عزت کا معیار کردار کی بجائے دولت اور طاقت کو بنالیا گیا ہے۔خیانت اور بے ضمیری کا روگ دین کے علمبرداروں تک جا پہنچا ہے۔غرض مجموعی طور پر پورا معاشرہ خوف خدا اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے تقریباً عاری ہو چکا ہے اور اخلاقی اعتبار سے ہمارا ہر قدم پستی کی جانب اُٹھ رہا ہے۔سوال یہ ہے کہ دینی جماعتوں کے اجتماعات میں لاکھوں افراد کی شرکت کے باوجود قومی سطح پر اخلاقی زوال کا یہ عالم کیوں ہے اور دینی جماعتیں قوم کو درپیش اخلاقی بحران کا مقابلہ کرنے میں کیوں ناکام ہیں۔اس سوال کی اہمیت اس بنا پر اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ گزشتہ زمانے میں دینی جماعتوں کے پاس مالی اور افرادی وسائل بہت کم تھے مگر اس کے باوجود ان کا معاشرے پر اثر آج سے کہیں زیادہ تھا۔

ہمارے خیال میں اس کیفیت کی بنیادی وجہ دینی جماعتوں کے باہمی اختلافات ہیں۔ان اختلافات کے باعث یہ جماعتیں خود ہی ایک دوسرے کو غیر موثر کرتی رہتی ہیں۔عوام کے کردار و

اخلاق کی اصلاح کے بجائے ان کا اصل زور باہمی اختلافات پر رہتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرے کی مثبت اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کا وہ کام جو دینی طاقتوں کا اصل مشن ہونا چاہیے، مسلسل نظر انداز ہو رہا ہے اور اخلاقی زوال کو روکنے کی کوئی صورت بن نہیں پا رہی ہے۔ لہٰذا مسئلے کا حل تلاش کرنے کیلئے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان اختلافات کا اصل سبب کیا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اہل دین میں اختلاف کی کبھی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہوتی۔ نہ اللہ کی جانب سے علم اور رہنمائی کی کمی اس کا سبب ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ ایک دوسرے پر فوقیت کی خواہش ہوتی ہے جس کیلئے قرآن "**بغياً بينهم**" کی ترکیب استعمال کرتا ہے۔ قرآن میں کم از کم چار مقامات پر یہ بات الفاظ کے معمولی ردو بدل کے ساتھ کہی گئی ہے۔ سورۃ البقرہ کی ۲۱۳ ویں آیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

"ابتدا میں سارے انسان ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیاں جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے۔۔۔۔۔ (اور ان اختلافات کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتداء میں لوگوں کو حق بتایا نہ گیا تھا، نہیں) اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا انہوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لئے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی (**بغياً بينهم**) کرنا چاہتے تھے"۔

سورہ آل عمران کی ۱۹ ویں آیت میں یہی بات یوں کہی گئی ہے:۔

"جن لوگوں کو کتاب دی گئی ان کے درمیان اختلافات کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے علم آ جانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے (**بغياً بينهم**) کیلئے ایسا کیا"۔

یہی بات سورۃ شوریٰ اور سورۃ جاثیہ میں بھی کہی گئی ہے۔ قرآن کے ان چاروں مقامات پر ایک دوسرے پر زیادتی کرنے اور باہمی ضدم ضدا کی اس کیفیت کیلئے "**بغياً بينهم**"

کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ۔ جدید علم نفسیات میں اسے " غالب رہنے کا داعیہ" (DOMINATE URDE TO) کہا جاتا ہے ۔ دورِ حاضر کی ایک بلند پایہ تفسیر میں اس لفظ کی جو تشریح کی گئی ہے اس کے مطابق ۔۔۔۔۔۔"اس تفرقہ پردازی کا محرک کوئی نیک جذبہ نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنی نرالی اپچ دکھانے کی خواہش، اپنا الگ جھنڈا بلند کرنے کی فکر، آپس کی ضدم ضدا، ایک دوسرے کو زک دینے کی کوشش اور مال و جاہ کی طلب کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ ہوشیار اور حوصلہ مند لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ بندگان خدا اگر سیدھے سیدھے خدا کے دین پر چلتے رہیں تو بس ایک خدا ہوگا جس کے آگے لوگ جھکیں گے ۔ ایک رسول ہوگا جس کو لوگ پیشوا اور رہنما مانیں گے ۔ ایک کتاب ہوگی جس کی طرف لوگ رجوع کریں گے اور ایک صاف عقیدہ اور بے لاگ ضابطہ ہوگا جس کی وہ پیروی کرتے رہیں گے ۔ اس نظام میں ان کی اپنی ذات کیلئے کوئی مقام امتیاز نہیں ہوسکتا جس کی وجہ سے ان کی مشیخت چلے ۔ لوگ ان کے گرد جمع ہوں اور ان کے آگے سر بھی جھکائیں اور جیبیں بھی خالی کریں ۔ یہی وہ اصل سبب تھا جو نئے نئے عقائد اور فلسفے اور نئے نئے عبادت کے طریقے اور مذہبی رسموں کو ایجاد کرنے کا سبب بنا ۔ اور اسی نے خلق خدا کے ایک بڑے حصے کو دین کی صاف شاہراہ سے ہٹا کر مختلف راہوں میں پراگندہ کر دیا ۔ پھر یہ پراگندگی ان گروہوں کے باہمی بحث و جدال اور مذہبی و معاشی اور سیاسی کشمکش کی بدولت شدید تلخیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ نوبت ان خونریزیوں تک پہنچی، جن کے چھینٹوں سے تاریخ انسانی سرخ ہو رہی ہے"۔

اب ذرا اپنے اردگرد نظر ڈال کر دیکھئے کہ کیا آج ہم بالکل اسی صورت حال سے دوچار نہیں ہیں ۔ آخر تمام مسلمانوں کا ایک خدا، ایک رسول ﷺ اور ایک قرآن پر مکمل اتفاق ہونے کے باوجود وہ کونسی چیز ہے جو ہمارے دینی رہنماؤں کو مشترکہ مقاصد کی خاطر مشترکہ جدوجہد پر بھی متفق نہیں ہونے دیتی ۔ ان کے درمیاں اگر فی الواقع کوئی سنجیدہ علمی اختلاف ہو بھی تو اس کے حل کے لئے قرآن کا یہ نسخہ ہر وقت موجود ہے کہ "اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں تنازع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف پھیر دو" یعنی ان کی عدالت سے فیصلہ حاصل کرو ۔

لیکن اگر اس کے باوجود ہمارے مختلف دینی گروہ ایک دوسرے سے مفاہمت کیلئے تیار نہیں ہوتے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کے اختلاف کا سبب بھی اللہ کی جانب سے علم اور رہنمائی کی کمی نہیں بلکہ ایک دوسرے پر برتری کی خواہش کی وہی بیماری ہے۔ جس نے دوسری اُمتوں کو برباد کیا اور جس کیلئے قرآن ''**بغیاً بینھم**'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ''**بغیاً بینھم**'' کی یہ کیفیت ایک دین کے ماننے والوں میں یہ گروہ بندیاں اور ان کے درمیان برتری اور غلبے کی یہ کشمکش برپا کیوں ہوتی ہے؟ قرآن کی رو سے اہل دین میں اس انتشار کا اصل سبب پورے دین کو توازن اور اعتدال کے ساتھ اختیار کرنے کے بجائے، اپنے ذوق اور پسند کے مطابق اس کے مختلف حصوں کو منتخب کرکے ان پر بے جا اصرار کرنا اور ان ہی کو پورے دین کا اہم ترین جزو قرار دے دینا اور دوسروں سے اسے ماننے کا مطالبہ کرنا ہے۔

اس کیفیت کی بڑی جامع اور بھرپور عکاسی ہمیں سورہ مومنون کی آیت ۵۳ میں ملتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کو ایک امت اور ایک ہی دین کا علمبردار قرار دیتے ہوئے کہا ہے:۔

''تمہاری یہ اُمت ایک ہی اُمت ہے اور میں تمہارا رب ہوں اس لئے مجھی سے تم ڈرو، مگر بعد میں لوگوں نے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کرلیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہے''۔

دین میں فرقہ بندیوں کے اسباب کو سمجھنے کیلئے یہ قرآن کی ایک بڑی ہی اہم آیت ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دینی عناصر میں اختلافات کا بنیادی سبب مختلف طبقوں کی جانب سے اپنی اپنی پسند اور ذوق کے مطابق دین کے کسی ایک یا بعض اجزاء کو پورا دین بنا بیٹھنا ہے۔ مثلاً کوئی عشق رسول ﷺ کے کسی خاص تصور اور درود وسلام کو، کوئی تبلیغ کے کسی خاص انداز اور مخصوص نصاب کو، کوئی تصوف کے کسی متعین ڈھنگ کو، کوئی اہل بیت رسول ﷺ کی محبت کے کسی خاص مفہوم کو، اور کوئی سیاست، اقتدار اور نظام حکومت کی کسی خاص تعبیر کو پورا دین سمجھ بیٹھتا ہے۔ ضروری

نہیں کہ وہ زبان سے بھی یہ بات کہے مگر اس کے عمل سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ گویا دین میں اصل اہمیت تو بس اسی جزو کی ہے جسے اس نے اہم سمجھا ہے اور باقی تمام معاملات ثانوی اور غیر اہم ہیں۔

اس کے نتیجے میں ان مختلف گروہوں کی جانب سے دین پر عمل میں عدم توازن اور کمی بیشی کا زبردست مظاہرہ ہوتا ہے۔ کسی کیلئے جلسے، جلوس، نعرے، دھرنے اور مظاہرے، نمازوں سے زیادہ نہ سہی تو کم از کم ان کے بروقت اور باجماعت ادائیگی سے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ کسی کیلئے نظام حکومت کی تبدیلی اور قرآن وسنت کے عملی نفاذ کا معاملہ اہمیت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ٹھہرتا ہے۔ اس کی ساری دلچسپی صرف فضائل کے بیان، مخصوص انداز تبلیغ، گشت اور چلوں تک رہ جاتی ہے۔ کسی کیلئے دین کا سب سے بڑا مسئلہ یہ بن جاتا ہے کہ مسجد میں درود وسلام بہ آواز بلند پڑھا جائے اور کوئی مراقبوں اور عملیات ہی کو دین کی جڑ اور مغز سمجھنے کے خیال خام میں مبتلا ہو جاتا ہے جبکہ کسی کا دین ماتم اور تعزیہ داری سے آگے ہی نہیں بڑھتا۔

لیکن اس آیت میں صرف اتنی ہی بات نہیں بتائی گئی کہ لوگ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے، بس وہ اسی میں مگن ہے"۔ "**کل حزب بما لدیهم فرحون**" یعنی کوئی گروہ یہ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کرتا کہ شاید دوسرے لوگ بھی دین کے کسی حصے پر عمل کرتے ہوں اور ان سے ربط وضبط کے ذریعے ہمارے دینی علم میں کچھ اضافہ ہو سکے۔ اسی طرز فکر کے نتیجے میں مسجدیں، مدرسے، قرآن کی تفسیریں، فقہ کی کتابیں، اذان کے الفاظ، لباس، وضع قطع، ٹوپیوں اور داڑھیوں کے اسٹائل، عماموں کے رنگ، نعرے، اصطلاحات، طرز گفتگو اور نشست و برخواست کے طریقے سب کچھ الگ الگ ہو جاتا ہے۔ ہر گروہ کی طرف سے اپنا علیحدہ تشخص اور پہچان قائم رکھنے کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اگر وہی بات بھی کہنی ہو جو دوسرے دینی حلقے کہہ رہے ہیں تو اس کیلئے علیحدہ الفاظ وضع کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ اسلامی نظام کو اپنا مقصود قرار دیتا ہے تو دوسرا نظام مصطفیٰ کی اصطلاح استعمال کر کے اپنا الگ گروہ اور فرقہ قائم کرتا ہے۔ ایک مکتب فکر حدیث رسول ﷺ

کی پابندی کو اپنا شعار ٹھہراتا ہے تو دوسرا اپنی محفل کیلئے سنتوں بھرے اجتماع کی ترکیب وضع کر کے اپنی پہچان الگ کراتا ہے۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک ہی دین کے ماننے والوں میں مستقل نوعیت کے ائیر ٹائٹ کمپارٹمنٹس وجود میں آ جاتے ہیں۔ پھر گروہی تعصب کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اللہ و رسول ﷺ کی ارشادات پر بھی اپنے گروہ کے علماء کی رائے کو مختلف تاویلات کے ذریعے ترجیح دی جانے لگتی ہے۔

اس کیفیت میں مبتلا لوگوں کے سامنے ان کے مخصوص گروہی حوالوں سے کوئی بات پیش کی جائے، ان کے پیرو مرشد حضرات ان کے مسلکوں، جماعتوں اور تحریکوں کے بانیوں کے ارشادات سنائے جائیں، تب تو ان کے چہرے کھل اُٹھتے ہیں اور ان حوالوں سے پیش کئے جانے والے دلائل ان کی سمجھ میں بڑی آسانی سے آ جاتے ہیں۔ لیکن ان کے مخصوص گروہی فہم دین کے خلاف اگر اللہ اور رسول ﷺ کے اقوال بھی پیش کئے جائیں تو ان کی طبعیتیں مکدر ہونے لگتی ہیں اور دلوں کی تنگی ان کے چہروں سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ قرآن میں اس کیفیت کی بھی ہو بہو نشاندہی موجود ہے۔ سورہ زمر کی ۴۵ویں آیت ہے:۔

''جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکا یک وہ خوشی سے کھل اُٹھتے ہیں''۔

یہ روش اختیار کرنے والے لوگ دراصل زبان حال سے وہی بات کہتے ہیں جو انبیاء کرام کی دعوت الی اللہ کے جواب میں ان کے مخاطب، قرآن کے پیش کردہ ریکارڈ کے مطابق یوں کہا کرتے تھے کہ ''ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک طریقے پر پایا اور ہم ان ہی کی تقلید کرتے رہیں گے''۔ اس کیلئے ملاحظہ فرمایئے سورہ لقمان آیت ۲۱، سورہ زخرف آیت ۲۲، ۲۳، سورہ شعراء آیت ۷۴ اور قرآن کے دیگر مقامات۔

یہ درحقیقت وہی کیفیت ہے جو قرآن کے مطابق اللہ کے مقابلے میں علماء و مشائخ کو رب بنا لینے سے پیدا ہوتی ہے۔ سورہ توبہ کی ۳۱ویں آیت میں بنی اسرائیل کے حوالے سے اس کا ذکر ملتا ہے اور علماء و صوفیا اور دینی رہنماؤں کو رب بنا لینے کا اصل مفہوم حضرت عدی بن حاتمؓ سے

مروی نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے کسی شک وشبہ کے بغیر واضح ہو جاتا ہے جس کے مطابق ۔۔۔۔۔''یہود اپنے احبار و رہبان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے مگر ان کا حال یہ تھا کہ جس چیز کو ان کے علماء اور مشائخ حلال کہہ دیتے وہ اسے (اللہ و رسول کی کسی سند کے بغیر) حلال مان لیتے اور جس چیز کو حرام قرار دیتے، اسے حرام سمجھ لیتے تھے''۔

اس تفصیلی گفتگو سے قرآن وسنت کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ رسولوں کے لائے ہوئے دین واحد میں ان کے ماننے والوں کے درمیان اختلافات اس طرح پیدا ہوتے ہیں کہ پہلے تو بعض لوگ پورے دین کے بجائے اپنے اپنے ذوق اور پسند کے مطابق دین کے مختلف اجزاء کو اختیار کرتے ہیں، پھر اپنے اپنے موقف کی برتری ثابت کرنے کیلئے بحث و گفتگو کا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے جو رفتہ رفتہ تکرار اور لڑائی جھگڑے تک جا پہنچتا ہے۔ اخلاص کے ساتھ حق کی تلاش کا جذبہ ختم ہوتا جاتا ہے اور صرف اپنی ناک اونچی رکھنے کا داعیہ، جو اپنی اصل کے اعتبار سے خالصتاً شیطانی ہے اور جو اللہ کے دربار میں آدم کے مقابلے میں ابلیس کے غرور کا سبب بنا تھا، انسان کو نفس پرستی کی تاریک کھائیوں میں جا گراتا ہے۔ یہی یہ نفسیاتی کیفیت ہے جسے قرآن ''**بغیاً بینھم**'' سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ ہے وہ پروسس جو اُمت واحدہ کو، جسے حکم الٰہی کے مطابق سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مستحکم رہنا چاہئے، شکست وریخت کے عمل سے دوچار کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ آج پوری اُمت مسلمہ اسی صورت حال کا شکار ہے۔ خود ہمارے ملک میں دینی طاقتوں کے انتشار کے اسباب یہی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا جس کتاب ہدایت میں ہمارے ہر مسئلہ کا حل موجود ہے اور جو ہمارے افتراق و اختلاف کے اسباب کی یوں ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر رہی ہے، اس میں ہمارے اس انتشار کا علاج اور اتحاد کا نسخہ موجود نہیں ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ضرورت صرف اخلاص کے ساتھ اس ہدایت نامے سے رجوع کرنے کی ہے۔ اللہ کا یہ وعدہ ہمارے حوصلے بڑھا رہا ہے کہ ''**والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا** ''یعنی جو لوگ ہماری خاطر کوشش کریں گے ہم انہیں اپنی راہیں دکھائیں گے (عنکبوت ۶۹) آیئے اللہ کے اس وعدے پر بھروسہ

کرتے ہوئے اس کے عطا کردہ اس ہدایت نامے میں جو ہمیں تاریکیوں سے نکال کر روشنیوں میں لانے کیلئے بھیجا گیا ہے، اپنے اس مسئلے کا حل تلاش کریں کیونکہ کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنا وعدہ پورا کرنے والا ہو، **ومن اوفی بعھدہ من اللّٰہ** :ایک خدا کے ماننے والوں کے درمیان انتشار کے خاتمے اور اتحاد کی تجدید اور بحالی کا جو نسخہ قرآن تجویز کرتا ہے وہ انتہائی صاف ستھرا، سیدھا سادا اور ہر اُلجھاؤ سے پاک ہے۔ملاحظہ فرمایئے:۔

یعنی کہ"اے کتاب الٰہی کے وارثو! آؤ ایک ایسے کلمہ کی جانب جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت واطاعت نہیں کریں گے اور اس کے ساتھ کسی بھی ہستی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے کچھ لوگ کچھ دوسرے لوگوں کو اللہ کے مقابلے میں اپنا رب نہیں بنائیں گے"۔ (آل عمران:٦٤)

اس آیت میں اہل ایمان کیلئے اتحاد کی صرف ایک بنیاد قرار دی گئی ہے اور وہ ہے خدا پرستی، اور اس چیز سے روکا گیا ہے جو خدا پرستوں کو ٹکڑے ٹکرے کر دیتی ہے۔یعنی شخصیات پرستی اور اکابر پرستی، جسے انگریزی میں ہیروشپ کہتے ہیں اور جس کا سلسلہ بالآخر گروہوں کے قیام اور خدا کے مقابلے میں گروہ پرستی پر ختم ہوتا ہے۔تاہم انسانوں کو احکام الٰہی کے منشا و مقصد کے سمجھنے اور ان کی عملی صورت گری کی وضاحت کیلئے، ایک انسانی ماڈل بھی درکار ہے جو خدائی نقشے کے مطابق زندگی کی پوری عمارت تعمیر کر کے دکھائے، تاکہ ایک خدا کے ماننے والے اپنی زندگیوں کو اسی ایک نمونے کے مطابق استوار کریں اور یوں انتشار سے محفوظ رہیں۔یہ ہستی کوئی فرشتہ، کوئی جن یا کوئی اور مخلوق نہیں ہوسکتی کیونکہ انسان اپنے جیسے انسان ہی کی پیروی کا مکلّف قرار دیا جا سکتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ یہ انسان کون ہے؟

اللہ تعالٰی اگر یہ انتخاب انسانوں کی اپنی پسند پر چھوڑ دیتا تو یقیناً منتشر اور متفرق ہونے سے بچانے کی کوئی شکل ممکن نہ ہوتی اور ان کی یہ شکایت بالکل جائز ہوتی کہ ان کے رب نے انہیں متحد رکھنے کا کوئی اہتمام ہی نہیں کیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس انسانی ماڈل کے انتخاب کا کام بھی انسانوں کے خالق نے ہر دور میں خود ہی انجام دیا ہے۔ہر اُمت میں اس مقصد کیلئے رسول بھیجے جاتے

رہے اور اسلام کے پہلے دور میں مسلمانوں اور گزشتہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ سب کیلئے قرآن بار بار جس انسان کو قابل تقلید نمونے کے طور پر پیش کرتا اور جسکے اسوہ زندگی پر سب کو یکجا ہونے کی دعوت دیتا ہے، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات گرامی ہے۔ مثلاً مسلمانوں اور اہل کتاب دونوں سے قرآن کا یہ خطاب ملاحظہ فرمایئے۔

''انجام کار نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لئے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔ بھلا اس شخص سے بہتر اور کسی کا طریق زندگی ہوسکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی۔ اس ابراہیمؑ کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنالیا تھا''۔

(النساء ۱۲۳،۱۲۵)

آخر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک سارے انبیائے کرام میں سے صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کو اسلام کے دور اول میں مسلمانوں اور اہل کتاب کیلئے ایک ایسے نمونے کی حیثیت سے کیوں پیش کیا، جسکی پیروی پر قرآن کے مطابق سب کو اتفاق کر لینا چاہئے۔ واضح طور پر اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ذات تمام اہل کتاب میں مکمل طور پر غیر متنازع تھی اور ان کا اسوہ زندگی سب کے نزدیک اطاعت الٰہی کا کامل نمونہ تھا۔ اسی لئے قرآن اس دور میں تمام اہل کتاب کو اللہ کی اطاعت اور تمام شخصیات پرستیوں سے دامن بچاتے ہوئے اسوہ ابراہیمی پر متحد ہو جانے کی دعوت دیتا رہا۔۔۔ یہ تھا تمام اہل کتاب کیلئے قرآن کا پیش کردہ نسخہ اتحاد۔

اب سوال یہ ہے کہ آج کے دور میں منتشر و متفرق مسلمانوں کیلئے توحید اور اطاعت الٰہی کے بعد قرآن کے نسخہ اتحاد کا وہ دوسرا جزو کیا ہے جس کی رو سے ہمارے سامنے ایک ایسی غیر متنازع انسانی شخصیت کو آنا چاہئے جس کے اسوہ زندگی کے برحق اور تقلید کے لائق ہونے کے معاملے میں مسلمانوں کے کسی طبقے اور کسی گروہ کو کوئی اختلاف نہ ہو، یہ ہستی نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی

کے سوا اور کون ہو سکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول اکرم ﷺ کی غیر مشروط اطاعت کی تاکید بھی کی گئی ہے۔رسول ﷺ کی اطاعت کو خدا ہی کی اطاعت بتایا گیا ہے۔ان کی زندگی کو مسلمانوں کیلئے اسوۂ حسنہ یعنی بہترین نمونۂ عمل قرار دیا گیا ہے اور واضح طور پر حکم دیا گیا ہے کہ:۔

''جو کچھ رسول ﷺ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے، اس سے رُک جاؤ''۔ (الحشر۔۷)

یہ ہیں وہ بنیادیں جن پر قرآن تمام مسلمانوں کو یکجا ہونے کی دعوت دیتا ہے۔اور اگر صرف ان ہی کو اتحاد کی بنیاد بنایا جائے تو اہل دین کو کوئی چیز پراگندہ نہیں کر سکتی لیکن خرابی وہاں سے پیدا ہوتی ہے جہاں اللہ اور رسول ﷺ کے بعد مختلف افراد اور گروہ اپنے اپنے ذوق اور پسند کے مطابق کسی تیسری ہستی کو، اس کی عقیدت اور محبت میں غلو سے کام لیتے ہوئے، دوسروں سے بھی اسی درجہ میں منوانے کی کوشش شروع کرتے ہیں۔جس درجہ پر وہ خود اسے فائز سمجھتے ہیں۔اب یہ خواہ علی مرتضیٰؓ کی ذات ہو یا دیگر اہل بیت رسول ﷺ، مختلف ائمہ فقہ ہوں یا بزرگان دین، صوفیائے عظام اور اولیائے کرام ہوں یا دورِ جدید میں مختلف اسلامی تحریکوں کے گرامی قدر بانیوں، مختلف دینی سیاسی جماعتوں کے رہنما ہوں یا بڑے بڑے دارالعلوموں کے سربراہان و اساتذہ، مفسرین قرآن ہوں یا مختلف مذہبی مکاتب فکر کے بانی ۔۔۔اللہ و رسول ﷺ کے بعد کسی کو بھی دین میں حجت قرار دینے کی کوشش گزشتہ اُمتوں کو بھی کاٹنے اور پھاڑنے کا سبب بنی ہے اور اُمت محمدی کے افتراق کا اصل سبب بھی یہی ہے۔

مستقل نوعیت کے مختلف فقہی مسلکوں، صوفیا کے حلقے اور نئے جدید دور میں دینی اور سیاسی جماعتوں کی گروہ بندیاں، سب اسی طرز فکر کی پیداوار ہیں۔گزشتہ اہل کتاب میں اسی طرح کی گروہ بندیوں کو بے بنیاد اور خود ساختہ ٹھہراتے ہوئے قرآن میں کہا گیا تھا۔

''اے اہل کتاب، تم ابراہیمؑ کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیمؑ کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں۔پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟ ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی، وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا''۔(آل عمران ۶۵۔۶۶)

غور کیجیے، کیا یہ آیات ٹھیک اسی کیفیت پر چسپاں نہیں ہوتیں جس میں آج ہم اہل اسلام مبتلا

ہیں۔ اگر آج اللہ کا کوئی نبی ہمارے درمیان اُٹھایا جاتا اور اسے کوئی کتاب بھی دی جاتی تو کیا اس میں یہی آیات کچھ اس طرح موجود نہ ہوتیں کہ:۔

''اے مسلمانو! تم محمد ﷺ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ تمام فقہی مسالک، تصوف کے سلسلے، دارالعلوموں کی تفریقیں، دینی جماعتوں کی گروہ بندیاں، یہ تو بعد کی پیداوار ہیں۔ پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے؟ محمد ﷺ نہ شیعہ تھے نہ سنی، حنفی تھے نہ مالکی، حنبلی تھے نہ شافعی، قادری تھے نہ نظامی، دیوبندی تھے نہ بریلوی، وہ تو بس ایک مومن یکسو تھے اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھے''۔

قرآن کی یہ واضح ہدایات ہمیں بتاتی ہیں کہ اللہ و رسول ﷺ کے بعد جہاں کسی تیسری ہستی کو دین میں حجت ٹھہرانے کی کوشش کی جاتی ہے، وہیں سے اختلاف و انتشار کا آغاز ہو جاتا ہے۔ رسولوں کی اُمتیں متحارب گروہوں میں تقسیم ہوتی چلی جاتی ہیں اور نئے نئے فرقوں کے وجود میں کبھی ختم نہ ہونے والا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان فرقوں کی، جو اللہ کی نظر میں سخت ناپسندیدہ ہیں، پہچان یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک صرف اپنے برحق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسرے تمام اہل ایمان کو گمراہ قرار دیتا ہے۔ ہر فرقے کے نزدیک لوگوں کی نجات کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ بس اس مخصوص فرقے سے وابستہ ہو جائیں ورنہ اللہ کی رضا انہیں حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ گزشتہ اہل کتاب میں بھی یہی مرض رونما ہوتا رہا ہے۔ جس کا ریکارڈ قرآن میں محفوظ ہے اور آج اُمت محمدی ﷺ میں بھی یہی بیماری اپنے عروج پر ہے۔ ذرا گزشتہ اہل کتاب کے مختلف فرقوں کے دعوے ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ کیا یہ وہی بولیاں، وہی لہجہ اور وہی زبان نہیں ہے، جو آج ہمارے دین کے علمبرداروں کے مختلف طبقوں اور گروہوں نے اختیار کر رکھی ہے۔

''ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو حالانکہ یہ محض ان کی تمنائیں ہیں۔ اس سے کہو: اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ دراصل نہ تمہاری کچھ خصوصیت ہے نہ کسی اور کی۔ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے، اس کیلئے اسکے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کیلئے کسی خوف یا رنج کا موقع نہیں۔ یہودی کہتے ہیں: عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں، یہودیوں کے پاس کچھ نہیں حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں اور

اسی قسم کے دعوے ان لوگوں کے بھی ہیں ۔جن کے پاس کتاب کا علم نہیں ہے ۔یہ اختلافات جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں،ان کا فیصلہ اللہ قیامت کے دن کر دے گا''۔(البقرہ ۱۱۱۔۱۱۳)

ان آیات میں ''یہودیوں اور عیسائیوں کے ناموں کو مسلمانوں کے مختلف فرقوں مثلاً دیوبندیوں، بریلویوں،حنفیوں، مالکیوں اور مختلف دینی سیاسی جماعتوں کے نام سے بدل دیجئے تو ہو بہو وہی نقشہ سامنے آ جائے گا جس سے آج ہمیں سابقہ درپیش ہے ۔اگر نزول وحی کا سلسلہ بند نہ ہو گیا ہوتا تو کیا آج یہی آیات ناموں کی ان تبدیلیوں کے ساتھ ہمارے انتباہ کیلئے نہ اتاری جاتیں؟ اس خیال سے اختلاف یقیناً بہت مشکل ہے ۔۔۔اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان ناموں کی حیثیت کیا ہے جو آج ہم نے رکھ لئے ہیں اور جن کی بناء پر ایسے مسلمان تقریباً نا پید ہو گئے ہیں جو کسی سابقے یا لاحقے یا فرقے کے بغیر اپنے آپ کو صرف مسلمان کہتے ہیں ۔فرقوں اور مسلکوں کی تقسیموں کی بنیاد دراصل اپنے اپنے گروہ کے احبار و رہبان، علماء و مشائخ اور بزرگوں کی شخصیت پرستی پر ہے، جو درحقیقت بت پرستی ہی کی ایک شکل ہے ۔اسی لئے اکابر پرستی اور گروہ پرستی کے مرض میں مبتلا گزشتہ اہل کتاب کیلئے قرآن نے حضرت ابراہیم کی بار بار جو مثال پیش کی ہے،اس میں تقریباً ہر جگہ اہل کتاب کی گروہ پرستی کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''اورابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا''۔یہ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ اکابر پرستی اور گروہ پرستی دراصل شرک ہی کی ایک نہایت شدید قسم ہے ۔ان فرقوں کے بارے میں قرآن کا ارشاد ملاحظہ فرمایئے:۔

''دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں،اللہ نے ان کیلئے کوئی سند نازل نہیں کی ۔حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے ۔کیا انسان جو کچھ چاہے،اس کیلئے وہی حق ہے؟ دنیا اور آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے ۔

(النجم ۲۳۔۲۴)

اللہ کے نزدیک ان ناموں، سابقوں، لاحقوں اور فرقوں سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث یا کچھ اور ہونا اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔اسکے دربار میں تو صرف ایمان اور عمل صالح کا سکہ چلتا ہے ۔اس سلسلے میں گزشتہ اہل کتاب سے اس کا یہ خطاب ہمارے لئے تا قیامت مشعل راہ ہے ۔

''یقین جانو کہ نبی عربی کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی ہوں یا صابی، جو بھی اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کیلئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے''۔(البقرہ۔۶۲)

بات واضح ہے کہ گروہی ناموں کی اللہ کے دربار میں کوئی قیمت نہیں۔اسے کسی کے یہودی، عیسائی، صابی، دیوبندی، بریلوی، جماعتی یا غیر جماعتی ہونے سے کوئی سروکار نہیں۔اس کے ہاں صرف تو شہ ایمان و عمل درکار ہے اور اس نے ہر دور میں اپنے فرمانبردار بندوں کیلئے صرف ایک نام پسند کیا ہے اور وہ ہے مسلم۔وہ خود ہی کہتا ہے: **هو سما کم السملین من قبل و فی هذا** یعنی اس نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے۔ (الحج ۷۸)اور جس طرح یہودیوں اور عیسائیوں میں اکابر پرستی کی بناء پر ہونے والی فرقہ بازیوں کو ختم کرنے کیلئے اس نے سب کو حضرت ابراہیمؑ کے اسوۂ زندگی کو نمونۂ عمل بنانے کی یوں تلقین کی تھی کہ ''یہودی کہتے ہیں کہ یہودی ہو تو راہ راست پاؤ گے، عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔ان سے کہو: نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیمؑ کا طریقہ۔اور ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھا۔(البقرہ ۳۵)اسی طرح اس نے اُمت محمدی کیلئے محمدﷺ کے طریقے کو اسوہ حسنہ قرار دیا ہے اور فرقہ بازیوں اور گروہ بندیوں سے بچنے کیلئے اسی طریقے پر یکجا ہو جانے کی تاکید کی ہے۔

یہ ہے اتحاد بین المسلمین بلکہ اتحاد بین الناس کی وہ صاف اور سیدھی شاہراہ جس کی جانب قرآن پیہم ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔جس کو نازل ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ ہمیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائے۔اب یہ فیصلہ کرنا ہمارا اپنا کام ہے کہ ہم افتراق و انتشار کی پستیوں اور فرقہ واریت کی تاریکیوں ہی میں ڈوبے رہنا چاہتے ہیں یا اتحاد و اتفاق کی بلندیوں کو اپنی منزل بناتے ہیں۔ (بشکریہ ماہنامہ ''سوچنے کی باتیں'' ماخذ ہفت روزہ تکبیر 19 نومبر 1998)

انسانی مسئلہ

(علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی)

انسانی مسئلہ پر مفکرِ حضرت علامہ المشرقیؒ کا حیات افروز اور عالم انگیز سائنسدانوں کے نام خط جس نے سائنسی دُنیا میں ۱۹۵۱ء سے تہلکہ مچا دیا ہے اور جسکی وجہ سے صحیفۂ فطرت کا عالم تسخیر کائنات کے عمل کی طرف پہلی بار متوجہ ہوا ہے۔

یہ حیات افروز اور تہلکہ انگیز خط جون ۱۹۵۱ء میں پہلی بار یورپ اور امریکہ کے مشہور ترین سائنسدانوں کو دُنیائے علم وخبر کے مفکرِ اعظم حضرت علامہ المشرقی نے اس نیت سے بھیجا کہ وہ موجودہ انسانی علم کی ظلمتوں سے نکل کر صحیفۂ فطرت کے سب سے بڑے مسئلے یعنی مقصد پیدائش کائنات کی طرف متوجہ ہوں اور اشیائے فطرت کے خودغرضانہ اور ظالمانہ استعمال سے ہٹ کر نوع انسانی کو فطرت کی راہ پر چلائیں۔ اس سے ۲۵ برس پہلے ۱۹۲۶ء میں حضرت علامہ نے مشہور عالم پروفیسر آئن سٹائن کو تذکرہ کی تعلیم سے آگاہ کر کے وہ خراج تحسین حاصل کیا تھا کہ اس کی مثال موجود نہیں اور وہ پروفیسر مرتے دم تک ان کا محبِّ شفیق بنا رہا۔ اس خط کے جواب میں ۱۹۵۱ء میں بعض مشہور ترین سائنسدانوں نے ولولے سے لکھا کہ عالمگیر پیمانے پر اس خط کی اشاعت لازمی ہے۔ ۱۹۵۵ء کے اخیر میں چنانچہ مسلسل اشاعت شروع ہوئی اور کم وبیش ۲۰ ہزار سائنسدانوں کو یہ خط بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا گیا۔ جن میں دو ہزار روس کے سائنسدان بھی شامل تھے۔ اس وقت درجنوں سائنسدان اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے میدان عمل میں نکل آئے اور تسخیر کائنات کا عظیم الشان مقصد انہوں نے اپنے ہاتھ میں لینا شروع کی۔ اسی ۱۹۵۵ء میں ایک جرمن شہزادے نے ۲۵ لاکھ روپیہ کی پیشکش حضرت علامہ کو کی کہ وہ سائنسدانوں کی مجوزہ کانفرنس اس کے دارالخلافہ (واڈز) میں کریں۔ ابھی اس کانفرنس کی تیاریاں ہو ہی رہی تھیں کہ انگلستان، فرانس اور جرمنی کی حکومتوں نے حضرت علامہ کے خط کو انتہائی طور پر انقلاب انگیز یقین کر کے اس کی راہ میں بے شمار روکاوٹیں پیدا کر دیں حضرت علامہ کے پاسپورٹ کی تجدید روک

دی اور جرمن شہزادے کو بنوک سنگین کانفرنس کے انعقاد سے روک دیا۔

۱۹۵۷ء میں روس کی طرف سے پہلا مصنوعی سیارہ فضائے آسمانی میں پھینکا گیا اور اس وقت آج تک سائنسی دنیا تسخیر کائنات کے متعلق ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ اور یہ دعویٰ کہ سائنسی دنیا میں پچھلے بارہ سال میں جو بے پناہ ترقی ہوئی ہے اس کا اول اور آخری باعث یہ خط ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں جو حقیقت سے کچھ بعید نہیں۔

بہ حیثیت ایک صحیفۂ فطرت کے طالب العلم جو بیکراں، لامحدود اور تا حال نا تحقیق شدہ ہے اور جو نہ صرف انسان کے سامنے پیش کی گئی ہے بلکہ اس پر مشاہدہ کے لئے تھوپ دی گئی ہے میں آپ کو اس امید پر مخاطب کر رہا ہوں کہ آپ ان ہزار ہا عالمان فطرت میں سے جن کو میں نے دنیا کے کوشے کوشے میں مخاطب کیا ہے، ایک ہونے کی حیثیت میں ان بنیادی انسانی مشکلات کے حل کرنے میں رہنمائی کریں جو سب کو متحیر کر رہی ہیں۔ یہ حیرانی اس وقت اور بھی زیادہ ہو رہی ہے کیونکہ انسانی ذہن پچھلی چند صدیوں کی علمی ترقی کے بعد اس امر پر مصر اور بہ ضد ہو رہا ہے کہ کائنات کے پیدا کرنے کا مقصد کیا ہے، کیونکہ انسان نے محض بے توجہی یا معصومانہ غفلت کے باعث تا حال اس موضوع پر بحث ہی نہیں کی۔ انسانی ذہن اس سلسلے میں ٹھوس نتیجوں پر پہنچنے کا خواہاں اس لئے ہے کہ صحیفۂ فطرت کے علم کی ترقی ایک مستقل نصب العین کے ماتحت ہو اور وہ نصب العین ایسا ہو جو اس کو علمی طور پر مطمئن کر دے اور اس کے آئندہ عمل میں ولولہ پیدا کرے۔

وقت آ گیا ہے کہ عالمان فطرت اس موضوع کے متعلق ابتدائی لیکن مضبوط نتائج پر پہنچیں تا کہ علم کی رفتار کو جو اس وقت تک بلا شبہ نہایت ناقص ہے نیا دھکا لگایا جائے۔ آپ کا جواب انسانی ترقی کی تاریخ میں ایک بے مثال مرحلے کو پیدا کر دے گا اور غالباً اس کا نتیجہ مستقبل قریب میں ایک عالمان فطرت کی عالمی کانفرنس کی صورت میں ہو گا جو یورپ یا امریکہ کی کسی موزوں جگہ پر ہو سکتی ہے تا کہ یہ یہ کانفرنس اس عالمی نصب العلین کا اعلان کرے اور اس کے لیے کام شروع کر دے جو انسان کو اس کی آخری تقدیر کی طرف مضبوطی سے لے جائے۔

میرے پاس اس امر کے مضبوط وجوہات ہیں کہ یہ کانفرنس بہت جلد منعقد ہو سکتی ہے۔

بشرطیکہ آپ بھی اس سے متفق ہوں میرے اظہارات اس مسئلے کے متعلق لف ہیں۔ میں آپ سے فوری جواب کی امید کرتا ہوں میں خوشی سے بشرط علم ضرورت جس قدر رسنخے اس خط کے آپ چاہیں گے مہیا کردوں گا۔ "علامہ مشرقی"

ایم اے (پنجاب ۱۹۰۶ء ایم۔اے۔کیمرج) بی۔ایس۔سی۔بی۔ای۔بی او۔ایل۔ایف۔آر۔ایس اے (۱۹۲۳ء سے بذریعہ دعوت) ایف جی ایس (پیرس)، ایف ایس اے (پیرس) ایف آر پی ایچ آئی (بذریعہ دعوت)، آئی۔ای۔ایس (مستعفی ۱۹۳۰ء) رینگلر فونڈیشن سکالر بیچلر سکالر (کرائسٹ کالج) چار (اول درجے وغیرہ کے) ٹرائی پوس، پنجاب اور کیمرج یونیورسٹیوں کے ریکارڈ توڑے! پرنسپل اسلامیہ کالج سنٹرل ٹریننگ کالج، حکومت ہند محکمہ تعلیم کا اول انڈر سیکرٹری (۱۹۱۶) ممبر دہلی یونیورسٹی بورڈ ایک ریاست کے وزیراعظم کی پیشکش (۱۹۱۳)۔ سفارت کی پیشکش (۱۹۲۰) ممبر کے خطاب کی پیشکش (۱۹۱۶)۔صدر میتھمیٹیکل سوسائٹی، مصنف تذکرہ ۱۹۲۴، مندوب اعلیٰ موتمر خلافت قاہرہ (۱۹۲۶)، بانی خاکسار تحریک (۱۹۳۰) مندوب فلسطین عالمی کانفرنس صدر ورلڈ فیتھس کانفرنس (۱۹۳۷)، گولڈ میڈلسٹ ورلڈ سوسائٹی آف اسلام (پہلے حاصل کرنے والے صرف مصطفیٰ کمال پاشا صدر جمہوریہ ترکیہ و رضا شاہ پہلوی صدر جمہوریہ ایران) ممبر انٹرنیشنل کانگریس آف اورنٹیلس (لائیڈن) (۱۹۳۱)، بانی اسلام لیگ۔ مصنف حدیث القرآن ۱۹۵۱ء، مصنف تکملہ وغیرہ

انسان کو دیگر مخلوق پر امکانی برتری

1۔ اگر صحیفہ فطرت کی لامتناہی وسعتوں اور لامحدود دوریوں میں زندگی کے وجود کی فہم و شعور کے ساتھ پیوستہ ہو جانے کی سہولتیں اب تک صرف ہماری اس چھوٹی سی زمین پر ہی میسر ہوئی ہیں تو کروڑ در کروڑ آسمانی کرے بیکار اور ویران پڑے ہیں اور فطرت یا تو ناقابل یقین حد تک فضول خرچ اور بے مقصد نظر آتی ہے یا پھر اس تمام کائنات میں انسان ہی وہ واحد وجود ہے جو کسی عظیم اور پر معنی مقصد کے لئے کھڑا ہے۔

انسان کے علاوہ دیگر باشعوروں کا موجود ہونا ممکن ہے

2۔ یہ کہنا کہ فہم و شعور کا وجود گوشت پوست اور خون والی زندگی کے بغیر ممکن نہیں غلط ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام کائنات (ماسوائے زمین کے) شعور سے خالی ہے جس سے قدرت پھر نا قابل یقین طور پر فضول خرچ اور بے مقصد ثابت ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے کسی ایک غالب الکل اور حادی مطلق شخصیت کا صحیفۂ فطرت کو انتہائی فہم و ادراک سے تعبیر کرنا۔ جیسا کہ بہتوں نے سمجھا ہے۔ اگر مان لیا جائے تو اس امر کی دلیل ہوگا کہ کائنات میں شعور گوشت اور خون کے بغیر بھی موجود ہے اس سے ہم اطمینان کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ باشعور زندگی کیلئے گوشت اور خون کا ہونا اس کا لابدی جزیا نا قابل انفصال لازمہ نہیں بلکہ یہ کہ (مذکورہ بالا غالب الکل وجود سے قطع نظر کر کے) ذی شعور مخلوق کی اور صورتیں انسان کے علاوہ بھی کائنات میں موجود ہیں جو اس زمین والے گوشت اور خون سے علاوہ ہیں۔

3۔ اگر گوشت اور خون سے مبرا دوسری ذی شعور پیدائش اس کائنات میں یقیناً موجود ہے، یا اگر انسان سے مختلف اعضائے جسمانی رکھنے والی بھی اور ذی شعور ہستیاں موجود ہیں تو فہم و شعور کے لحاظ سے وہ ہستیاں انسان سے بہت زیادہ ارفع و اعلیٰ نہیں ہوسکتیں کیونکہ نہ اب تک ان کا انسان سے کوئی لگاؤ یا ملاپ پیدا ہوا ہے، نہ وہ کسی اور عنوان سے اس کائنات میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اس بنا پر موجودہ حالات میں کام چلانے کے لئے اگر کوئی وقتی فریضہ استوار ہوسکتا ہے تو یہ ہے کہ سردست انسان ہی اس کائنات کے طول و عرض میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر ہوشمند ہے اور اس کو یہ مرتبہ کسی خاص الخاص مقصد کے لئے دیا گیا ہے۔

انسان کا کائنات کو مسخر کرنا پیدائش کائنات کا واحد مقصد ہے

4۔ یہ خاص مقصد سوائے اس کے نہیں ہوسکتا کہ انسان تمام کائنات کو اپنی گرفت میں لے کر اس کی مکمل طور پر تسخیر کرے۔ یہ قبضہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسان اس زمین کے گوشت اور خون کو چھوڑ کر کسی ایسی اعلیٰ اور ارفع پیدائش کی طرف ارتقا نہ کرے جسکی شکل و شباہت تمام آسمانی کروں کے معاشی حالات و احوال کے مطابق پورے طور پر ہو۔

باوجودیہ کہ صحیفۂ فطرت کواب قریباً لاحدود ثابت کیا جارہا ہے اورباوجودیہ کہ انسان کی طرف سے تسخیر کائنات کا اِدّعا اس وقت کسی شیخ چلی کی بڑ سے زیادہ معلوم نہیں دیتا تاہم یہ نا قابل رد حقیقت سامنے کھڑی ہے کہ اگر انسان کا ظہور اس زمین پر تسخیر کائنات کے عظیم مقصد کے لیے نہیں اور اس کوحاصل کرنے کے امکانات بھی اس میں موجود نہیں تو یہ کائنات سب کی سب ایک بےمقصد اور بےمعنی نمائش ہے بلکہ انسان کا ادنیٰ حیوانات سے لاکھوں برس میں ارتقاء کےبعد حاصل کیا ہوا فہم وشعور بھی ایک بےمقصد حصول اور فضول شے بن جاتا ہے اور اسکی اشیائے فطرت کے استعمال سے حاصل کی ہوئی طاقت ایک بےمعنی اور لایعنی کوشش بن کر رہ جاتی ہے جو ہم کو کسی طرف نہیں لے جاتی ۔یہ صورت حال اگر تسلیم کرلی جائے تو تمام کائنات لغویات اور واہیات کا ایک بےمعنی ڈرامہ بن جاتی ہے جو عقل تسلیم نہیں کرتی ۔اس بنا پر تسخیر کائنات ہی لامحالہ انسان کے اس زمین پر ظاہر ہونے کا واحد مقصد ہے اور اسکو بہرصورت حاصل کرنا ہی پڑیگا خواہ اس میں کتنی ہی دشواریاں حائل ہوں۔

انسان کی اندرونی خلفشار اور کور اندیشی!

5۔بنی نوع انسان میں اس قسم کے ارتقا کے کوئی آثار ابھی تک نمایاں نہیں ہوئے کیونکہ اس نے ابھی تک اس کی قدرت کے خلاف طویل جدوجہد کے دوران کائنات کے کسی دوسرے حصے پر قبضہ کرنے کے متعلق بہ حیثیت نوع کوئی قابل ذکر تقاضا پیدا نہیں ہوا۔اُدھر حقیقت یہ ہے کہ انسان نے ابھی تک زمین کے وسائل کے شاید سوویں(100)حصے پر بھی قبضہ نہیں کیا۔وہ زیادہ تر اپنی ہی نوع کے خلاف جنگ آرائی میں مصروف رہا ہے۔یہ وہ مصروفیت ہے جو زمین کے مادی وسائل کو انسان کی ایک مخصوص قوم کی تحویل میں دے کر(اور باقی قوموں کو تباہ کرکے)انسان کی جدوجہد کی موجودہ شدت کو بالآخر ڈھیلا کردے گی اور لازمی ہے کہ بحیثیت نوع اس کی آئندہ ارتقائی صلاحیتوں کے امکانات کو بھی کمزور یا کلیتہً ختم کردے۔

بنی نوع انسان کی داخلی خودکشی کے باعث اس کے نیست ونابود ہوجانے کے امکانات

6۔کارخانہ قدرت میں شاید انسان ہی ایک ایسی نوع ہے جو اپنی ہی نوع سے لامتناہی طور پر برسرِ پیکار ہے اور وہ یہ غیر فطری خودکشی اپنے ناقص فہم وادراک کے باعث کررہا ہے جو اس وقت

اسے مجموعی طور پر حاصل ہے۔بجائے اس کے کہ فطرت کے خلاف مجموعی جنگ کر کے ارتقا کرتا جائے جیسا کہ ادنیٰ نوعیں روز اول سے لگاتار کرتی چلی آئی ہیں اور اس طرح فطری طور پر برتر مخلوق تک ارتقا کرتی رہی ہیں، اس نے اپنی جدوجہد کا انوکھا طریقہ اختیار کیا ہے، وہ یہ کہ اس نے ایک قوم کا دوسری قوم پر غلبہ حاصل کر کے اس کو فنا کر دینا اپنا صحیح مشغلہ سمجھ لیا ہے جس کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوگا کہ زمین سے باہر نئی زمینوں اور نئے معاشی وسائل پر قبضہ کرنے کی خواہش پیدا ہی نہ ہو سکے گی اور لازمی ہے کہ اس روشنی سے اس کی نوع پر ایک مدت کے بعد مکمل جمود طاری ہو جائے، وہ نوع قعر مذلت میں گرتی چلی جائے بلکہ بڑے پیمانے پر جدوجہد کے فقدان یا غلبہ سے پیدا ہوئی ہوئی کاہلی اور سستی کے باعث وہ نوع صفحۂ ہستی سے ہی نابود ہو جائے۔

انسان کے عجیب وغریب تعصّبات

7۔انسان کی انسان کے ساتھ اس جنگ میں کئی وجوہات (مثلاً مذہب، نسل، رنگ، قومیت جوع الارض، سرمایہ داری، نصب العینی تجرد جغرافیہ، تاریخ وغیرہ وغیرہ) کارفرما ہیں اگر چہ مذہب تک بھی بنیادی طور پر اس داخلی فساد کا شائد سب سے زیادہ طاقتور متحرک ہے۔

انسان نے مجموعی طور پر اب تک اس سیدھی سادی سچائی کو بھی نہیں سمجھا کہ دنیا کے نام نہاد ''پیغمبر'' اگر وہ سب کے سب ایک خدا کی طرف سے ہی آئے تھے جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے تو ممکن نہ تھا کہ وہ ایک خدا سے ایک ہی نوع انسانی کی طرف مختلف پیغام لاتے، نہ ان کے آنے کا مقصد ہرگز یہ ہوسکتا تھا کہ وہ انسان کو انسان سے لڑائیں۔انسان کی داخلی خانہ جنگی کی دوسری وجوہات علمی یا علم حیات کے نقطہ نقطۂ نظر سے اور بھی زیادہ لغو ہیں۔نوع انسانی پر اندرونی تفرقہ اور انتشار کا یہ سانحہ عظیم اس لئے رونما ہوا ہے کہ انسان (ہوش وفہم کا مالک ہو کر بھی بحیثیت مجموعی مضحکہ خیز طور پر فطرت کے منشاء اور رلم سمجھنے سے قاصر رہا ہے اور بہت ہی کم افراد (شاید لاکھوں میں سے ایک بھی نہیں) ایسے ہیں جو کائناتی طور پر سوچ سمجھ سکتے ہوں۔اس بنا پر نوع انسانی کی یہ مجموعی حماقت اس کی موجودہ غیر فطری نشو ونما اور زوال کا باعث ہے اور ممکن ہے کہ یہی نا سمجھی اس کے روئے زمین سے بالآخر نیست ونابود ہو جانے کا باعث بن جائے۔

نئے جہانوں پر قبضہ کرنے کی اُمنگ کیسے پیدا ہو؟

8۔نوعی کشمکش حیات کے سلسلے میں اس کرہ زمین سے باہر کی نئی زمینوں پر قبضہ کرنے کی امنگ بنی نوع انسان میں صرف اسی صورت میں پیدا ہوکر کمال تک پہنچ سکتی ہے کہ یہ زمین مکمل امن اور افراط رزق کے باعث روز بروز بے پناہ طور پر آباد ہوتی جائے اور بالآخر انسانی نطفے کے سطح زمین کے گوشے گوشے پر پھیل جانے، انسانی زندگی کی انتہائی قدر و قیمت کے جذبے کے عام ہو جانے، انسان کی جسمانی صحت کے وسائل کی مکمل طور پر دریافت ہونے، بلکہ انسان کے باہمی مکمل تعاون کے بعد زمینی وسائل سے مکمل استفادہ سے تجاوز کر کے اس کی عملی اور ذہنی قوتوں کے کامل اشتراک عمل سے نئی زمینوں پر قبضہ کرنے کے ولولے پیدا ہوتے جائیں۔ ایک قوم کے دوسری قوموں پر غلبہ حاصل کر کے اسی کو ہلاک کر دینے کی جدوجہد میں یہ ولولہ ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا۔

چھوٹے چھوٹے دائرہ ہائے عمل میں بھی انسان کا انسان پر ظلم و تشدد

9۔انسان کی ان غلط کاریوں پر اس کے بین الاقوامی فسادات سے ہٹ کر پھر اگر اس کے اور مشغلوں کی طرف نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ چھوٹے چھوٹے دائرہ ہائے عمل میں بھی انسان کی کور تدبیری اور بدبختی انسان کو انسان کا غلام بنانے میں شرمناک طور پر مصروف ہے۔ مغربی نمونے کی نام نہاد ''جمہوریت'' جس کا نتیجہ آج سرمایہ دار کی بے پناہ چڑھ ہے، انسان کو انسان کا غلام بنانے کی خاطر قوم کی غریب اکثریت کو انتہائی بیدردی سے کچلتی رہتی ہے اور آئے دن کی عالمی جنگیں پیدا کر نیکی غرض سے سرمایہ دار کو انسان کا آقا بناتی رہتی ہے۔ یہ ''جمہوریت'' حال ہی میں اشتراکیت کی نئی صورت میں ظاہر ہوئی ہے جس کے شہنشاہی عزائم مغربی جمہوریت کے عزائم سے بھی بدتر ہیں اور جس کا نصب العین خود مزدور کو جتھوں میں منظم کر کے بہتر طور پر حکومت کے استعمال میں لانا ہے۔ الغرض انگلستان کے لارڈ ہیلی فکس کے قول کے مطابق نہ صرف یہ کہ ''دنیا کی بہترین سیاسی جماعت بھی قوم کے خلاف ایک سازش ہے''۔ بلکہ یہ کہ غریب اکثریت کی حکومت صحیح معنوں میں آج تک کسی ملک میں قائم نہیں ہوئی، حتیٰ کہ روز اول سے استعمال شدہ سپاہی کی حکومت بھی کسی جگہ قائم نہ ہوسکی حالانکہ سپاہی حکومت کرنے کا منطقی حق اس لئے رکھتا ہے وہ ملک کی حفاظت کی خاطر اپنی جان تک دے دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سیاستدان، سرمایہ دار کو اپنا

معاون بنا کر، غریب کو کچلنے کے گھناؤنے ارادوں سے ان چھوٹے چھوٹے دائرہ ہائے اختیار میں بھی مختار مطلق ہے۔

انسانی تباہی کے لئے مشینوں اور ہتھیاروں کی ایجاد

10۔انسان کے ان خودساختہ تعصّبات کے دباؤ کے ماتحت اس کی یہ کج اندیشی جس کا نتیجہ انسان کو ہلاک کرنے کے لئے آئے دن تباہی کے نئے نئے ہتھیار ایجاد کرنا ہے انسان کو (بلکہ آجکل کے سائنسدانوں کے ایک مکتب خیال کو بھی) اس طرف لے گئی ہے کہ انسان کے جسمانی اعضاء کا نشو ونما اور ارتقا مکمل طور پر ہو چکا ہے اور اس کے امکانات بہت کم ہیں کہ ان اعضا میں مزید ارتقا ہو سکے یا ان کی بناوٹ مختلف ہو سکے۔مایوسی کی یہ نفسیاتی کیفیت صاف طور پر پست انسانی مقاصد سے پیدا شدہ تنگ نظری کی وجہ سے ہے۔اس طرح سے حالانکہ انسان لکھوکھا برس سے بلا روک ٹوک بلکہ نا قابل انسداد اور باضابطہ طور پر ارتقائی مراحل طے کرتا چلا آیا ہے۔اس کے آئندہ ارتقا پر بے معنی روک اس وجہ سے لگا دی گئی کہ اس کو بے وجہ ''سلسلہ تخلیق کا کمال'' فرض کرلیا گیا ہے۔جو بہر نوع قطعاً ناجائز اور صریحاً نا قابل تسلیم ہے۔

روئے زمین پر واحد ''مافوق البشر'' قوم کا تصور

الغرض ان لوگوں میں جن کے ذہن نسل انسانی کو ہلاک کرنے کے سلسلے میں علمی ترقیوں کے بڑھ چڑھ کر قدم مارنے کی وجہ سے مخمور و ماؤف ہو چکے ہیں انسانی ارتقا کا موجودہ نظریہ یہ ہے کہ روئے زمین پر ایک مختصری قوم بالآخر رہ جائیگی جو موجودہ انسانی اعضاء و جوارح رکھتی ہوئی کامل طور پر نشو ونما یافتہ دماغ کی حامل ہوگی۔اس قطع کا ''طبیعی انتخاب'' نہ صرف یہ کہ صحیفۂ فطرت میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی بلکہ بنی نوع انسان کی اجتماعی طور پر آزاد مجموعی طور پر منظم اور پوری نوع کے اجماعی طور پر مکمل ارتقا کی راہ میں ایک غیر فطری رکاوٹ ہے۔اس کا لازمی نتیجہ اس مافوق البشر قوم کے حق میں بالآخر جدو جہد کے فقدان کی وجہ سے مکمل زوال کی صورت میں ہوگا۔کسی نوع کے دماغ اور اعضا کا ارتقا تلاش رزق کے سلسلے میں اس نوع کی جانکاہ مجموعی جدو جہد سے ہی ہو سکتا ہے، نہ یہ کہ اس نوع کا ایک چھوٹا سا گروہ اپنے غلبے، امن اور فراوانی رزق کے ماحول میں بہتر نوع کی طرف منتقل ہو سکے۔

پست ذہنی کے باعث انسان کے تنگ نصب العین

11۔انسان نے اپنے بین الاقوامی تنازعات کی پیدا کی ہوئی تنگ نظری کے ماحول میں یہ فرض کرلیا ہے کہ:۔

(۱)اس کی جدو جہد کا کوئی میدان عمل ضرورت کے طور پر اس زمین سے باہر کے کسی آسمانی کرتے تک وسعت نہیں رکھتا۔

(۲)زمینی وسائل معاش کو قابو میں لانے کا اول و آخر مقصد ایک قوم کا دوسری کمزور قوم پر غلبہ حاصل کر کے اس کو ملیامیٹ کرنا ہے، نہ یہ کہ کسی اعلیٰ اور ارفع مقصد کو پیش نظر رکھ کر ان وسائل کو زمین کے طول و عرض میں پھیلانا ہے۔

(۳)انسانی کشمکش حیات دراصل بین الاقوامی تنازعوں کو نبٹنے کا دوسرا نام ہے جس سے پرے وہ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہا۔

(۴)انسان کا اولین کام اس دنیا میں یہ ہے کہ وہ زمین کی بیجان اشیا کو انسان کے انسان پر غالب کرنے کے لئے استعمال میں لائے۔

(۵)انسانی زندگی اور دوسری زندگیوں کے متعلق اس کی تجرباتی طریقوں سے چھان بین کی غرض و غایت ان معلومات کو اپنے گروہ کی بہبودی کے لئے استعمال کرنا ہے،زندگی کے عظیم مسئلے کی تہ تک پہنچ کر،زندگی کو آپ پیدا کرنے پر قادر ہونا یا زندگی کے عظیم راز کو افشا کرنے کا مسئلہ اس کے نزدیک محض ایک علمی مشغلہ ہے جس کا حل کرنا انسان کے بلند تر درجوں تک ارتقا کرنے کے لئے ناگزیر نہیں۔

(۶) کرہ زمین پر زندگی کا وجود زیادہ تر اس لئے ہے کہ انسان ان زندہ اشیاء کو اپنے آرام کے لئے یا بطور غذا استعمال یا اگر وہ زندہ شے اس کے مخالف ہے تو اس کو ہلاک کردے۔

(۷) تسخیر کائنات کی غرض سے انسان کی ،فطرت کے خلاف ،نوعی جدو جہد محض ایک دُور کا تصور ہے جو انسان کی شدید طبعی درماندگی کے باعث کسی سنجیدہ توجہ کے لائق نہیں ۔انسان ابھی تک یہ سوچنے سے بھی انکاری ہے کہ کرہ ارض کے معاشی وسائل بالاتر مقصد کی خاطر تمام انسانیت کے مساوی استعمال کے لئے ہیں نہ کہ اس لوٹ کھسوٹ کے لئے جو یہ سمجھے بیٹھا ہے۔(جاری)

قوم پرستی یا اسلام

(پروفیسر کریم بخش نظامانی)

تاریخ فلسفہ اور سیاسیات کی کتابوں میں قوم پرستی کے متعلق بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ اس جذبے کے اگر کچھ نقصانات ہیں، تو کسی حد تک جذبہ مظلوم اور محکوم عوام کو آزادی پر اُبھارنے کا محرک بھی ہے۔ اس لحاظ سے اس کی افادیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ خصوصاً مغربی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنے میں قوم پرستی اور وطن پرستی کے جذبے نے افریقہ اور ایشیا کے محکوم عوام کیلئے ایک طاقتور محرک کا کام دیا۔

لیکن ۸۰ کے عشرہ سے لے کر آج (مئی ۱۹۹۰ء) تک صوبہ سندھ میں میں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا، اور کانوں سے جو کچھ سنا اس نے مجھے ایک نئے ذہنی اور روحانی تجربہ سے دوچار کیا اور میں نے اپنے خیالات کا از سر نو جائزہ لیا۔ اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قوم پرستی اور انسان دشمنی میں کوئی اتنا زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ اس جذبہ کا اصل محرک محبت کے بجائے نفرت ہے۔ قوم پرستی اس وقت تک ایک انسان کو عمل کے میدان میں کود پڑنے پر آمادہ نہیں کر سکتی جب تک ''اپنوں'' سے محبت کے ساتھ ساتھ ''غیروں'' سے نفرت نہ کی جائے۔ جذبہ نفرت جب انسان کے قلب و روح میں اتر جاتا ہے تو محبت ماند پڑھ جاتی ہے بلکہ پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ ایک حقیقی اور باعمل قوم پرست وہی ہو سکتا ہے جس کے دل میں اپنی قوم کے حقیقی یا مفروضہ دشمن یا حریف کیلئے بے پناہ نفرت بھی موجود ہو۔

محبت اور نفرت:۔ بلا شبہ محبت ایک پاکیزہ اور قابل قدر جذبہ ہے۔ والدین کی اپنی اولاد سے محبت ہی کو لیجئے۔ ماں اپنے بیمار بچہ کی تیمارداری میں اپنی ذات کو بھلا دیتی ہے۔ رات رات بھر جاگتی ہے اور اگر بچہ زیادہ بیمار ہو تو اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ کھانے اور سونے جیسی بنیادی ضروریات تک کو بھول جاتی ہے۔ اسی طرح ایک باپ اپنی اولاد کی پرورش کیلئے رات دن محنت کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ بیماری، بڑھاپا اور جسمانی ضعف بھی ایک غریب باپ کو بے پناہ محنت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اس محنت کے عوض والدین اپنی اولاد سے کسی ''حق محنت'' کے نہ تو طالب ہوتے ہیں اور نہ ہی تقاضا کرتے ہیں۔ وہ اپنی محنت کی صرف اتنی ''مزدوری'' چاہتے ہیں کہ اولاد کو خوش و خرم دیکھیں۔ ہم نے تو ایسی مائیں بھی دیکھی اور سنی ہیں جنہوں نے چکی پیس کر اور سلائی کڑھائی کا کام کر کے اپنے یتیم بچوں (جن کے باپ وفات پا

گئے ہیں) کو اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں اب بھی لاکھوں ایسے غریب والدین موجود ہیں جو اپنی بیٹیوں کو دلہن بنتے دیکھنے کی تمنا میں اپنا پیٹ کاٹ کر جہیز جمع کرتے ہیں۔ ان حقائق سے مغرب کے ان عالمان حیاتیات (Biologists) اور ماہرین نفسیات کی ان آراء کی تردید ہوتی ہے کہ انسان بنیادی طور پر خود غرض اور "ذات پرست" ہی ہے۔ کچھ ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ اولاد چونکہ انسان کی ذات کا جزو ہے اس لئے اپنی اولاد میں وہ دراصل اپنی "ذات کا تسلسل" پا کر اس کیلئے ایثار کرتا ہے۔ یہ لوگ واقعہ کا سبب (Cause) تو بیان کرتے ہیں، لیکن امر واقعہ سے انکار نہیں کرتے۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ کئی معاشروں میں والدین کا ایثار تسلسل سے چلا آ رہا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بے غرض اور بے لوث محبت، انسانی فطرت کا جزو لاینفک ہے۔ محبت اکتسابی (Acquired) نہیں بلکہ جبلی ہے۔ اگر ایثار اور محبت کے جذبات نہ ہوتے تو نوع انسانی کا تسلسل بھی مشکل تھا۔ یہ جذبات انسان تو انسان، جانوروں اور پرندوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس نفرت ایک اکتسابی جذبہ ہے۔ اس دنیا میں داخل ہوتے ہی انسان کا پہلا تجربہ محبت ہوتا ہے۔ وہ ماں سے چمٹتا ہے اور ماں اسے محبت کے ساتھ دودھ پلاتی ہے۔ نفرت اگر انسان یا دوسرے جانداروں کی فطرت میں ودیعت کردہ یعنی (Inbron) ہوتی تو نوع انسانی تو کیا کسی بھی نوع کا بقا اور تسلسل ناممکن ہوتا۔ انسان اور دوسرے جانداروں میں مزاحمت کے مظاہر کا مشاہدہ کرنے کے بعد کچھ ماہرین نفسیات نے نزاع پسندی (Pagnacity) کو بھی ایک جبلت (instinct) قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک اس نزاع پسندی کا سرچشمہ بھی جذبہ محبت ہی ہے۔ مثلاً جب کوئی چیل نیچی پرواز کر کے کسی مرغی کا کوئی چھوٹا بچہ اُچکنے کی کوشش کرتی ہے تو بچوں کی ماں بے دھڑک چیل پر جھپٹتی ہے اور اگر چیل بچہ اُچکنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو مرغی بھی جست لگا کر زمین سے اوپر اٹھنے اور جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے "اڑنے" کی کوشش کرتی ہے۔ ایسے ہی وہ اس بلی کا پیچھا کرتی ہے اور اسے پنجے مارتی ہے جس نے اس کا کوئی بچہ اٹھا لیا ہو۔ مرغی کی طرف سے نزاع پسندی کا یہ مظاہرہ چیل یا بلی سے نفرت کے سبب نہیں، بلکہ اپنے بچوں سے محبت کا نتیجہ ہے ورنہ مرغی یا مرغے کا یہ معمول نہیں ہے کہ کسی بھی چیل یا بلی کو دیکھ کر غصے سے پاگل ہو جائے اور اس پر پل پڑے۔ تمام جانداروں میں نزاع پسندی اس لئے ودیعت کی گئی ہے کہ بوقت ضرورت اپنا اور اپنوں کا تحفظ کر سکیں۔

نفرت کی قابل مذمت صورتیں ''غصہ'' اور ''جذبۂ انتقام'' ہیں۔ ''غصہ'' انسان کی فطرت میں شامل ہے، لیکن خالق کائنات نے اس کے اظہار سے منع فرمایا ہے۔ قرآن پاک میں اہل ایمان اور نیک بندوں کی ایک خوبی یہ بھی بیان کی گئی کہ ''وہ غصہ کو پی جاتے ہیں''۔

قوم پرستی کا اصل محرک:۔ قوم پرستی کی تحریکوں کی جان ہی نفرت ہے۔ جب تک نفرت نہ ہو، قوم پرستی کوئی قابل ذکر سیاسی قوت نہیں بن سکتی۔ برہمنیت اس کی کلاسیکل مثال ہے۔ برہمن نہ صرف اپنے آپ کو ''سپر مین'' تصور کرتا ہے، بلکہ ذات پات کے نظام میں اپنے سے نیچی ذات، خصوصاً شودروں سے اس کو نفرت ہے۔ جب مسلمان برصغیر میں داخل ہوئے تو ان کو بھی ''نیچ ذات'' میں شمار کر کے ''ملیچھ'' کا لقب دیا گیا اور ان کے خلاف نفرت کے جذبے کی پرورش کی گئی یہ اور بات ہے کہ مسلمانوں کی عسکری قوت کے آگے بے بس ہو کر، برہمنیت اپنی نفرت کے اظہار کا کوئی راستہ نہ پا سکی۔ لیکن نفرت برقرار رہی۔ ہندو اور مسلمان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ تک اس برصغیر میں ایک ساتھ رہے لیکن اس طرح جیسے دو متوازی خطوط ہوتے ہیں جو ہزاروں میل تک ساتھ ساتھ چلے جانے کے بعد بھی کبھی مل نہیں پاتے۔ یہاں کی کوئی بھی سیاسی تبدیلی ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم نہ بنا سکی۔ حتیٰ کہ دو تین صدیوں تک انگریز کی مشترکہ غلامی میں بھی وہ ''متوازی خطوط'' ہی بنے رہے۔

برہمن کوئی کام کاج نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی لڑ سکتا تھا۔ یہ تو اس ''برتر'' مخلوق کی شان کے منافی تھا۔ اس مقصد کیلئے اس نے ویش اور کھشتری سے اچھا سلوک کیا۔ سماجی تعلقات میں بھی ان کا مقاطعہ نہ کیا اگر ایسا کرتا ہے تو تجارت اور لڑائی کون کرے گا۔ شودروں کو برداشت کر لیا گیا اس لئے کہ یہ ''نیچ مخلوق'' اپنی ذلت پر بخوشی آمادہ ہو گئی برہمن اور ہندوانیت نے جین دھرم کے پیروکاروں اور بودھوں کا الگ تشخص گوارا نہ کیا۔ چنانچہ ان مذاہب کے پیروکاروں کا برصغیر سے بڑی حد تک خاتمہ کر دیا گیا۔ ہندوؤں کو اس کی کچھ قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ چنانچہ غازی محمد بن قاسم کی سندھ میں آمد کے موقع پر جن مقامی قبائل اور برادریوں نے اسلام قبول کیا یا مسلمانوں سے تعاون کیا کم و بیش وہ سارے لوگ بدھ مت کے پیروکار او رراجہ داہر کے برہمنی راج سے متنفر تھے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ''ہندو قومیت'' کی بنیاد غیر ہندو سے برتر ہونے کے احساس اور اس سے نفرت کرنے کے جذبہ پر مبنی ہے۔ چنانچہ آزادی ہند کے بعد اس جذبہ نفرت کو کھل کھیلنے کا

موقع ملا اور مسلمانوں کے خلاف اس کا بھرپور اظہار کیا گیا۔ اس جذبہ نفرت نے بھارتی مسلمانوں کیلئے تین ہی راستے چھوڑے ہیں۔ یا تو وہ اپنا ''ملیچھ'' ہونا منظور کر لیں اور اچھوتوں کی طرح ''نیچ مخلوق'' بن کر رہیں یا بودھوں کی طرح ملیا میٹ ہو جانے کیلئے تیار ہو جائیں یا تیسرا راستہ یہ ہے کہ وہ پہلی منزل کے طور بھارت ہی کے اندر ایک الگ مسلم صوبہ بنائیں اور دوسری منزل پر ایک نیم خودمختار ''مسلم بھارت''، ''مسلم ہندو'' یا ''مسلم انڈیا'' کے نام سے برصغیر میں چوتھی ریاست کو وجود میں لائیں۔ باقی یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ برہمو سماج میں انہیں برابر کا شہری تسلیم کر لیا جائے۔ سکھوں کی مثال سامنے ہے۔ اس جنگجو قوم نے تقسیم کے وقت ہندوؤں کی حمایت میں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا اور اس ''جذبہ تعاون'' کا معاوضہ انہیں یہ ملا کہ گولڈن ٹیمپل پر ہندو فوج نے ہلہ بول دیا۔

اگر ہندو قوم پرستی پر ''غیر ہندو سے نفرت کا جذبہ'' غالب نہ ہوتا تو یہ بے جان مذہب علم و آگہی کے اس دور میں اسلام کی ''تبلیغی یلغار'' کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوانیت کو اپنی بقا کیلئے ہر وقت ''نفرت کی غذا'' چاہیے۔ فی الحال یہ غذا مسلمانوں اور سکھوں کے وجود فراہم کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال ہندوستان کی ''نیچ ذات'' کے لئے ایک ''غیبی امداد'' ثابت ہو رہی ہے۔ اگر کسی تاریخی عمل سے یہ دونوں قومیں بیچ میں سے ہٹ جاتی ہیں۔۔۔تو پھر برہمنیت اپنی کالی دیوی کا پیٹ بھرنے کیلئے اچھوتوں اور شودروں کو اس کے استھان پر بھینٹ چڑھائے گی۔

''نفرت کی غذا'' پر پلنے والی قوم پرستی کی دوسری مثال ہمیں نازی جرمنی کی صورت میں ملتی ہے۔ بلاشبہ پہلی جنگ عظیم میں جرمن قوم کو جن شرائط پر صلح کرنے کیلئے مجبور کیا گیا وہ انتہائی ظالمانہ اور ذلت آمیز تھیں۔ معاہدہ ورسیلز (۲۸ جون ۱۹۱۹ء) کی رو سے جرمنی کو ''جنگی مجرم'' قرار دے کر، اس کے تمام مقبوضات اس سے چھین کر فاتح قوموں نے ''کفن چوروں'' کی طرح آپس میں بانٹ لیے۔ جرمنی کو بھاری جنگی تاوان ادا کرنے پر مجبور کرنے کے ساتھ ساتھ یہ پابندی بھی عائد کی گئی کہ جرمنی اپنی فوجوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ نہیں بڑھائے گا۔ اس کی فوج کے پاس کوئی ٹینک، بھاری توپ خانہ اور جنگی ہوائی جہاز نہیں ہوگا۔ وہ دس ہزار ٹن سے زیادہ وزنی بحری جہاز اپنے بیڑے میں شامل نہیں کرے گا۔ یہ تمام سخت شرائط تھیں۔ اس کے باوجود فرانس اور برطانیہ شور مچاتے رہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ جرمنی سے اس معاہدے پر احتجاجاً دستخط کیے کہ ایسا کرنے کے سوا کوئی اور چارہ کار ہی نہیں تھا۔ اسی معاہدے سے جرمن قوم میں تمام یورپی اقوام،

خصوصاً فرانس اور برطانیہ کے خلاف کوٹ کوٹ کر نفرت کا جذبہ بھر دیا۔ ’’نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی‘‘ (جس کو حقارت سے ’’نازی‘‘ کہا جانے لگا) کی مقبولیت اور ہٹلر کے عروج کا سبب معاہدہ ورسیلز کہا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے اسباب کچھ اور بھی ہیں۔

احساسات برتری اور قومیت

جرمن قوم کے افضل (Super) ہونے کا فلسفہ گھڑا گیا۔ خون کے معائنے کر کے کہا گیا کہ ہم خالص آریائی نسل کے لوگ ہیں لہٰذا دنیا پر حکمرانی اور برتری ہماری پیدائشی حق ہے۔ ویسے برتر اور افضل ہونے کا یہ خناس تو تمام یورپی اقوام کے دماغ میں اٹھارویں صدی ہی سے سما گیا تھا اور جب انہوں نے افریقی اور ایشیائی اقوام کو غلام بنانا شروع کیا تو دعویٰ یہ تھا کہ ان غیر مہذب لوگوں کو جدید تہذیب سے روشناس کروانا ہمارا فرض منصبی ہے۔ ڈارون کے نظریہ ارتقا میں بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کے مفروضے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ لیکن جرمنی کے قوم پرست فلسفیوں اور سائنسدانوں نے ایک ہی جست میں اصلح (Fittest) اور افضلیت کے اعزازات اپنے ہی لئے مخصوص کر لیے۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے، قوم پرستی کو ’’نفرت اور انتقام‘‘ کی خوراک کی بھی ضرورت ہے۔ جرمنوں کو فرانس اور برطانیہ سے نفرت تو ہو گئی لیکن یہ بڑی قوتیں فی الحال تو ’’انتقامی زد‘‘ سے باہر تھیں۔ البتہ جرمنی کے یہودی ان کے ہتھے چڑھ گئے۔ شرابی کو جتنی پلاؤ کہتا یہی رہے گا کہ ’’اور لاؤ‘‘ یہی حال جذبہ انتقام کا ہے کہ یہ ہے وہ آتش جو لگ جائے تو بجھائے نہیں بجھتی۔ جرمن قوم کو جنگ عظیم اول کے بعد قوم پرستی کے سارے لوازمات ـــ احساس برتری، نفرت اور انتقام ـــ فوری مہیا ہو گئے اور دنیا نے دیکھ لیا ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو ذلت آمیز معاہدہ ورسیلز پر دستخط کرنے والی جرمنی نے پہلی ستمبر ۱۹۳۹ء کو بپھرے ہوئے شیر کی طرح پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ اور پھر دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی دور میں پوری دنیا اس کی فوجی قوت سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

تاریخ انسانی میں نفرت اور جذبہ انتقام نے بڑی سیاسی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ انقلابات فرانس، روس اور چین کی تہہ میں بھی یہ جذبہ اصل محرک کا کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ لینن کے بھائی کو جب زار کی حکومت نے پھانسی دی تو نوجوان لینن نے کہا کہ ’’ان کو بھگتنا پڑے گا‘‘۔ لینن کے کچھ سوانح نگار کہتے ہیں کہ اس کو انقلابی دراصل جذبہ انتقام نے بنایا تھا۔ اب آپ غور فرمایئے کہ

جب ایک پوری قوم اس جذبے سے سرشار ہو جائے تو کیا کچھ نہیں کر سکتی۔

لیکن تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ منفی جذبات نے ہمیشہ نوع انسانی اور خصوصاً ایسے جذبات کے حامل افراد اور اقوام کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ لہٰذا برہمن کی قوم پرستی نے ہند کو، اور ہٹلر کی قوم پرستی نے جرمن قوم کو کافی نقصان پہنچایا۔ یہ قوم ابھی تک اپنے ہی نازی بھائیوں کے لگائے ہوئے زخم چاٹ رہی ہے اور ادھر برصغیر میں آزادی کے بعد ایک لمحہ کو بھی پرسکون اور پرامن حالات نہیں رہے۔ میرے نزدیک اس کا اصل سبب برہمنت کا ''جذبۂ نفرت و انتقام'' اور احساس افضلیت اور اصلح (Fittest) ہے۔

بے دین سیاست:۔ سیکولر سیاسی فلسفوں میں کوئی بھی ایسا فلسفہ آپ کو نظر نہیں آئے گا جو پوری انسانی برادری کیلئے ہو۔ مارکسزم بھی، جس کے متعلق دعویٰ یہ کیا گیا ہے کہ یہ انسانیت کیلئے آفاقی فلسفہ ہے، صرف محنت کش طبقے کو پکارتا ہے۔ ''دنیا کے محنت کشو! ایک ہو جاؤ'' ! محنت کشوں میں سے بھی مذہبی اور دینی رجحانات رکھنے والے لوگوں کے لئے اس فلسفہ میں کوئی گنجائش نہیں۔

لیکن مارکسزم کی بنیادوں پر جب روس میں پہلی اشترا کی حکومت قائم ہوئی تو عالمگیر اور آفاقی ہونے کے بلند و بانگ دعوؤں کے باوجود اس حکومت نے روز اول ہی سے روسی قوم پرستی کا روپ دھار لیا۔ روسی اشترا کیوں نے دھوکے اور جارحیت سے زار شاہی کے زیر تسلط علاقوں پر آہستہ آہستہ قبضہ کرنا شروع کیا اور بالآخر حقیقی معنوں میں وہ ''اشترا کی زار شاہی'' بن گئی جس میں روسی قوم کا رتبہ وہی ہو گیا، جو برطانوی ہند میں کسی انگریز کا ہوتا تھا۔ اسی طرح چین کا کمیونسٹ انقلاب بھی بہت جلد چینی قوم پرستی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ روسی اور چینی افواج اپنے اپنے علاقوں میں ایک دوسرے کے سامنے آ گئیں۔ ادھر یوگوسلاویہ میں مارشل ٹیٹو نے ملک کے ایک حصہ پر قبضہ کرنے کے بعد ۲۹ نومبر ۱۹۴۳ء کو اپنی حکومت قائم کر لی۔ دو سال بعد (نومبر ۱۹۴۵ء) یوگوسلاویہ کے ''پبلک'' ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ آئون ربار (Ivanribar) صدر بنا۔ لیکن اصل قوت مارشل ٹیٹو کے پاس تھی، جسے کمیونسٹ ہونے کے ناتے روس کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ لیکن یہ روسی (کامریڈ شپ) زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ نتیجتاً مارشل ٹیٹو نے ۱۹۴۸ء میں روس سے تعلق توڑ لیا اور یوگوسلاویہ بھی قوم پرستی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ (جاری)

فرمودات اولیائے کرامؒ

(ایم طالب)

حضرت احمد مسروق رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "جس چیز سے عارف ڈرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب ہے"۔

فرماتے ہیں "تقویٰ یہ ہے کہ نہ آنکھوں سے دنیا کی طرف دیکھو اور نہ دل میں اُس کے متعلق فکر کرو"۔

فرماتے ہیں "معرفت کے درخت کو تفکر کا پانی دیا جاتا ہے اور غفلت کے درخت کو جہالت کا پانی ملتا ہے اور توبہ کے درخت کو ندامت کا پانی ملتا ہے"۔

فرماتے ہیں "زُہد یہ ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی چیز کو اپنا بادشاہ نہ سمجھے"۔

حضرت ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "مرید اول قدم میں مختار ہوتا ہے مگر آگے بڑھ کر اُس کو اختیار باقی نہیں رہتا وہ اپنے علم کو جہالت میں دیکھتا ہے ہستی کو نیستی میں مشاہدہ کرتا ہے اور اختیار کو بے اختیاری میں"۔

حضرت ابوبکر وراق رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "تمام برکات کی کلید مقامِ ارادت میں صبر ہے اگر ارادت درست ہوگئی تو پہلی برکت کشادہ ہوگئی"۔

فرماتے ہیں "آدمی تین طرح کے ہوتے ہیں۔(۱) اُمراء (۲) علماء (۳) فقراء۔

جب اُمرا تباہ ہوتے ہیں تو خلقت کی معاش تباہ ہو جاتی ہے۔

جب عالم تباہ ہوتے ہیں تو خلقت کا دین تباہ ہوتا ہے۔

جب فقراء تباہ ہوتے ہیں تو خلقت کا دل تباہ ہوتا ہے۔

فرماتے ہیں "اُس درویش کا دل بہت ہی اچھا ہے جس سے دنیا میں بادشاہ خراج طلب نہیں کرتا اور آخرت میں خدا اُس سے حساب نہ لے"۔

زُہد کے معنی پوچھے تو فرمایا "زُہد تین حروف سے مرکب ہے"۔

ز۔ سے ترکِ زینت۔

ہ۔ سے ترکِ ہوس۔

د۔ سے ترک دنیا۔

حضرت ابوعبداللہ محمد بن فضل رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا گیا ''شقاوت کی علامت کیا ہے''؟ جواب ملا ''تین باتیں''۔

(۱) حق تعالٰی علم تو عطا کرے مگر عمل کی توفیق نہ دے۔

(۲) عمل دے مگر اخلاص سے محروم رکھے۔

(۳) صالحین کی صحبت بخشے مگر انکے ادب کی توفیق نہ دے۔

فرماتے ہیں ''کہ زاہد کا ایثار بے نیازی کے وقت ظاہر ہوا کرتا ہے۔ جوانمرد کا ایثار حاجت کے وقت ظاہر ہوتا ہے''۔

حضرت ابومحمد مرتعش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''میں نے تیس سال تک محض توکل پر حج کئے لیکن جب غور سے دیکھا تو وہ سب کے سب ہوائے نفس سے تھے۔

پوچھا: وہ کیسے معلوم ہوا؟ فرمایا ''میری والدہ نے فرمایا پانی کا گھڑا لے آؤ۔ اُن کا یہ حکم مجھ پر ناگوار گزرا۔ جس سے معلوم ہوا کہ میرے حج تمام کے تمام خواہشات نفسانی کے ماتحت تھے۔

حضرت قطب الاولیاء ابی اسحٰق ابراہیم بن شہریار گازرونی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''خدا کا دوست کبھی دنیا کا دوست اور دنیا کا دوست کبھی خدا کا دوست نہیں ہوسکتا''۔ لوگوں نے پوچھا ''رزق جب مقسوم ہو چکا ہے تو پھر حق تعالٰی سے اس کی طلب وسوال کیا معنی رکھتے ہیں فرمایا ''تاکہ مومن کا عزوشرف ظاہر ہو''۔

نقل ہے کہ ایک روز شیخ کہیں جارہے تھے اور لوگ آپ کی زیارت کیلئے جوق درجوق آتے تھے۔ جن میں بچے بھی تھے۔ کسی نے پوچھا ''حضرت کم عقل بچے آپ کو کیسے پہچانتے ہیں'' فرمایا ''اس لئے کہ رات کو جب یہ سونے میں محو ہوتے ہیں تو میں ان کیلئے کھڑا ہو کر صلاح و برکت کی دعا مانگتا رہتا ہوں''۔ فرماتے ہیں ''ایمان خاص ہے اور اسلام عام''۔

فرماتے ہیں ''تم کو ہمیشہ شرعی علم کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور جب علم حاصل کرلو تو جو کچھ تم کو معلوم ہے اُس کو پوشیدہ مت کرو اور ہمیشہ رضائے الٰہی کے طالب رہو اور علم کو عمل میں لانے کی کوشش کرو۔ ورنہ بے جان جسم کی مانند رہو گے۔ زنہار اپنے علم و عمل سے طلب دنیا نہ

کرنا، جوشخص عمل آخرت سے دنیا کا طالب ہے اُس کی آبرو جاتی رہے گی اور جوشخص کاردنیا سے آخرت طلب کرتا ہے، آخرت میں اس کا نصیب کم نہ ہوگا حضرت ابن عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''سب سے بہتر وہ گناہ ہے جسکے بعد توبہ کی توفیق مل جائے'' فرماتے ہیں ''باطن حق تعالیٰ کی نظر کا مقام ہے اور ظاہر خلق کی نظر کی جگہ ہے''۔ فرماتے ہیں جوشخص ہمت سے ابتدا کرتا ہے وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ جوشخص ارادت سے ابتدا کرتا ہے وہ آخرت تک پہنچ جاتا ہے جسکی ابتدا زر سے ہوتی ہے وہ دنیا تک پہنچ جاتا ہے''۔ فرماتے ہیں ''جو چیز بندے کو آخرت سے باز رکھنے والی ہے وہ دنیا ہے'' فرماتے ہیں ''منافق کی روزی کھانا پینا ہے مگر مومن کی روزی ذکر و ریاضت ہے'' فرماتے ہیں ''پیغمبرانِ خدا کا ادنیٰ درجہ وہ ہے جو شہدا کا اعلیٰ مرتبہ ہے اور شہدا کا ادنیٰ مرتبہ وہ ہے جو صلحاء کا اعلیٰ مرتبہ ہے جو صلحاء کا ادنیٰ مرتبہ ہے وہ مومنوں کا اعلیٰ مرتبہ ہے''۔

فرماتے ہیں ''جسکی توبہ عمل سے ٹھیک ہوگی مقبول ہوگی''۔

حضرت احمد بن عاصم الانطاکی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں'' پانچ چیزیں دل کی دوا ہیں'' (۱) پیٹ کو خالی رکھنا (۲) اہل اصلاح کی ہم نشینی (۳) تہجد کی نماز (۴) گریئہ صباحی (۵) تلاوتِ قرآن پاک۔

حضرت احمد خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں جوشخص درویشوں کی خدمت کرے گا۔ اس کو تین خصلتیں ملیں گے۔ (۱) تواضع (۲) حسنِ ادب (۳) سخاوت۔

فرماتے ہیں ''خدا کے زیادہ نزدیک وہ ہے جسکا اخلاق زیادہ اچھا ہے''۔

آپ سے دریافت کیا گیا ''محبت کی کیا علامت ہے''؟ فرمایا ''دونوں عالم میں کوئی چیز محبوب سے زیادہ باعظمت نہ دکھائی دے اور سوائے خدمت محبوب کے اور کوئی خواہش دل میں نہ ہو۔ پھر لوگوں نے پوچھا ''کون سا عمل زیادہ افضل ہے''؟ فرمایا ''دل کو ماسوا اللہ سے محفوظ رکھنا۔

ایک دن کسی شخص نے آپ سے وصیت طلب کی تو فرمایا ''نفس کو مار ڈال تاکہ وہ زندہ ہوجائے''۔

(میاں عبدالرشید)

''ھمه اوست''

سید غوث علی شاہ قلندر فرماتے ہیں۔

''ایک بار شہر بریلی میں شاہ نیاز احمد سے ملاقات ہوئی۔چند روز ان کے پاس ٹھہرے۔ایک دن میاں صاحب فرمانے لگے۔تم ہمہ اوست کیوں نہیں کہتے؟ ہم نے عرض کیا۔جو کہتے ہیں،وہ قالی اور خالی ہیں اور جو حالی ہیں وہ کہتے نہیں۔دوسرے، ہم ٹھہرے طالب اگر ہمہ اوست کہیں تو طلب کس کی کریں۔

''مولانا صاحب تو چپ رہے،مگر ان کے خلیفہ بولے۔ہمارے حجرے میں آؤ۔ہم آپ کو توجہ دیں گے۔ہم نے کہا **بسم اللہ**!وہ حجرہ میں توجہ دینے بیٹھے تو ہم نے کہا۔اس وقت تو آپ بالکل اپنے پیر مولانا شاہ نیاز احمد معلوم ہوتے ہیں۔بولے۔**استغفر اللہ**!ذرہ کو آفتاب سے کیا نسبت۔ہم نے کہا **سبحان اللہ**!خدا بننے کو تو آپ تیار ہیں،مگر نیاز احمد نہیں بن سکتے۔

ایک اور واقعہ یوں بیان کیا ہے۔

''لدھیانہ میں محکم الدین شاہ کے مکان پر گئے ہم نے پوچھا،حضرت کا اسم شریف؟ بولے۔''خدا''ہم نے کہا''سبحان اللہ!ہم تو آپ کو آسمان پر تلاش کرتے تھے،آپ زمین پر ہی نکلے۔پھر ہمارا نام پوچھا۔ہم نے کہا''آپ کیسے خدا ہیں کہ اپنی مخلوق کا نام بھی نہیں جانتے''۔ذرا تامل کیا اور سوچ کر بولے۔''تم غوث علی ہو۔تمہارے والد کا نام احمد حسن اور دادا کا نام ظہور الحسن ہے''۔ہم نے کہا۔''بس بس معلوم ہو گیا۔آپ رمالی خدا ہیں۔جب تک زائچہ نہیں کھینچتے کچھ معلوم نہیں ہوگا''۔اتنے میں ایک شخص مرید ہونے کو آیا۔بعد بیعت اس سے کہا۔''پڑھ **لا الہ الا اللہ محکم الدین رسول اللہ**۔ہم نے کہا بس صاحب رسول تو مدینہ والے ہی کو رہنے دیجئے۔یہاں آپ کی دال نہیں گلے گی۔خدا ہی بنے رہے۔آپ سے پہلے اور بھی کئی خدا

بن چکے ہیں۔فرعون،نمرود،شداد وغیرہ‘‘۔(تذکرہ غوثیہ)

صحیفہ محبوب کے مرتب لکھتے ہیں۔

سائیں توکل صاحب نے فرمایا۔ابھی میں نابالغ یا قریب بلوغ تھا۔لدھیانہ میں ایک شخص محکم الدین کی شہرت سن کر اس کے پاس گیا۔وہ اپنے مریدوں سے یہ کلمہ پڑھواتا تھا۔**لا الـٰـہ الا الـلّٰـہ محکم الدین رسول اللّٰہ** ۔مجھے اس کا یہ کلمہ پڑھوانا پسند نہ آیا۔میں یقیناً جانتا تھا کہ محمدؐ رسول اللہ کے سوائے اور کوئی اس کلمہ میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتا۔‘‘ایک بار ایک شخص سائیں توکل شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور آتے ہی آپ کے سامنے سجدہ میں گر پڑا۔آپ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا’’خدا خدا ہے اور بندہ بندہ۔سجدہ غیر اللہ کو کرنا منع ہے‘‘اس نے کہا میں تو سجدہ کروں گا۔اُدھر بھی وہی ہے۔اِدھر بھی وہی ہے۔دوئی کہاں ہے‘‘۔ چند روز بعد اس کے مالی حالات بہت خراب ہو گئے۔پھر ایک روز حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا!میرے لئے دعا کریں۔آپ نے فرمایا!دعا کس سے کروں۔تم تو خود ہی خدا ہو۔ خدا کو دعاؤں کی کیا ضرورت ہے؟بہت رویا۔آپ نے فرمایا!بس دو دن کے فاقہ ہی سے دوئی آ گئی اور ساری خدائی جاتی رہی۔ (بشکریہ نوائے وقت)

ضروری اطلاع

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا سالانہ اجتماع انشاءاللہ

5,4۔اپریل بروز جمعہ،ہفتہ منعقد ہو رہا ہے

دارُ السلام

(عرفان صدیقی)

کوئی پاکستانی، ریاض آئے اور اُسے ''دارُالسلام'' دیکھنے اور عبدالمالک مجاہد نامی شخص سے ملنے کا موقع نہ ملے تو اسے یقیناً محرومی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ابھی میں اسلام آباد سے ریاض کیلئے رختِ سفر باندھ ہی رہا تھا کہ مجاہد صاحب کا فون آیا۔ ''پتہ چلا ہے آپ مجلس پاکستان کی دعوت پر ریاض آ رہے ہیں۔ تھوڑا سا وقت دارُالسلام کیلئے ضرور نکالئے گا''۔ مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ عبدالمالک مجاہد کو یہ گمان ہی کیسے گزرا کہ میں ریاض میں آؤں گا اور دارُالسلام میں حاضری دیئے یا اُن سے ملے بغیر ہی چلا جاؤں گا؟ شاید انہیں اندازہ نہیں کہ مجھے اس عظیم الشان اشاعتی ادارے سے کتنا عشق ہے اور میں ایک جنوں شعار شخص کے ذوق بادیہ پیائی کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں سن کر روح کی گہرائیوں تک اُتر جانے والی کیسی آسودگی محسوس کرتا ہوں۔

16 سال قبل ریاض سے اپنا سفر آغاز کرنے والا یہ طباعتی ادارہ بلاشبہ ایک عظیم مرکز بن چکا ہے۔ جو اسلامی کتب کی طباعت و اشاعت میں نت نئے تجربوں کے ساتھ منظم انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ریاستوں اور بڑی بڑی جامعات کے کرنے کا کام تھا جس کا بیڑا عبدالمالک مجاہد نے اُٹھایا اور پھر رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھلتے ہی چلے گئے۔ کیا آپ تصور کرسکتے ہیں کہ دارُالسلام کم و بیش ایک ہزار اسلامی کتب، دنیا کی 15 مختلف زبانوں میں شائع کرچکا ہے اور ان کے لاکھوں نسخے ہر سال طبع ہو رہے ہیں؟ قرآن پاک کے 13 زبانوں، اردو، انگریزی، فرنچ، ہسپانوی، پشتو، ترکی، البانی، بنگالی، فلپینی، ملیباری، انڈونیشی اور روسی زبانوں میں تراجم ہوچکے ہیں۔ فارسی، تامل، سنہالی، سواحلی، یوربا اور نیپالی زبانوں کے تراجم اس سال کے اختتام تک مکمل ہوجائیں گے۔ چینی اور جرمن زبانوں میں تراجم کیلئے ماہرین کا انتخاب ہوچکا ہے اور کام شروع ہونے کو ہے۔ ہندوستان کی زبانوں میراٹھی اور گجراتی کے تراجم زیرِ غور ہیں۔ دارُالسلام کا منصوبہ ہے کہ آئندہ پانچ سالوں کے اندر کرہ ارضی کے کسی بھی گوشے میں بولی جانے والی ہر زندہ زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ موجود ہوگا۔

عبدالمالک مجاہد اپنے علمی منصوبوں کیلئے مردانِ کار کی تلاش میں نگر نگر گھومتے رہتے ہیں۔ اِس وقت دنیا کے مختلف ممالک میں ان کا ایک مربوط نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔ نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، ہانگ کانگ، سنگاپور، سری لنکا، مالدیپ، بھارت، متحدہ عرب امارات، عمان، قطر، کویت، بحرین، یمن، شام، لبنان، اردن، مصر، سوڈان، جنوبی افریقہ، انگلینڈ، ڈنمارک، فرانس، بیلجیم، ترکی، ہالینڈ، سپین، امریکہ، کینیڈا، کوریا، ایران، اٹلی، بنگلہ دیش، مراکش اور الجزائر میں دارالسلام کی برانچیں یا اس کے ایجنٹ موجود ہیں۔ دارالسلام کا سب سے بڑا نیٹ ورک خود سعودی عرب میں ہے۔ ریاض میں تین بڑے شورومز کام کر رہے ہیں۔ الخبر، جدہ اور مدینہ منورہ میں بھی بڑے شورومز موجود ہیں۔ مکہ مکرمہ، ینبوع، خمیس، مشیط اور القسیم میں بھی برانچیں کام کر رہی ہیں۔ پاکستان میں لاہور میں تین شورومز کے علاوہ کراچی، اسلام آباد اور حافظ آباد میں بھی بڑے مراکز موجود ہیں۔ آئندہ ایک سال کے اندر اندر فیصل آباد، ملتان، سیالکوٹ، کوئٹہ، حیدر آباد اور مظفر آباد میں بھی برانچیں قائم کرنے کا منصوبہ ہے۔

اب کے دارالسلام گیا تو عبدالمالک مجاہد نے چند نئی کتابیں دکھائیں۔ یہ کتابیں دارالسلام کی روایت کے مطابق نہایت ہی خوبصورت اور معیاری طباعت کا حسین نمونہ تھیں۔ میں نے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پوچھا کہ یہ کہاں طبع ہوئی ہے؟ مجاہد صاحب مسکرائے اور بولے "اندازہ لگائیے"، مجھے معلوم تھا کہ دارالسلام کی کتب پاکستان، سعودی عرب، اٹلی اور بیروت سے طبع ہو رہی ہیں۔ گمان گزرا کہ شاید یہ کتب بیروت سے چھپی ہوں گی۔ لیکن عبدالمالک مجاہد نے انکشاف کیا کہ یہ کتابیں چین میں طبع ہوئی ہیں اور اب چین بھی ہمارے لئے ایک بڑا اشاعت گھر بن گیا ہے۔ پھر انہوں نے دلوں کے تار چھیڑنے والی ایک کہانی سنائی۔

"شنگھائی سے کوئی اڑھائی سو کلومیٹر دور ننگو کے مقام پر ہر سال دو بڑے میلے لگتے ہیں۔ ان میلوں میں آپ کو دنیا کی ہر شے ملے گی۔ طباعتی کمپنیاں بھی بڑے بڑے سٹال لگاتی ہیں۔ یہ کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ میں بھی اس میلے میں گیا تاکہ طباعتی اداروں کا جائزہ لے سکوں۔ وہاں میری ملاقات ایک لیوپول نامی ایک چینی سے ہوئی جو ایک ادارے سے وابستہ تھا۔ یہ ایک

بڑا ہی نفیس شخص تھا۔نہایت ہی کھرا اور ایماندار۔اپنے والدین کا بے حد احترام کرنے والا۔میں نے اُس سے کاروباری معلومات حاصل کیں۔پھر اُس سے تعلق بڑھتا چلا گیا۔میں اُس کی نیک طبعی کو دیکھتے ہوئے اکثر اُسے اسلام کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔یہ رمضان المبارک کے مہینے کا ذکر ہے میں اور لیو پول اکٹھے سفر میں تھے اور بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔جس ہوٹل میں ٹھہرے اُس کے ہیٹر بھی منجمد ہو چکے تھے۔صبح دم اُٹھے تو لیو پول میرے پاس آ بیٹھا بولا۔''میں بہت عرصے سے سوچ رہا تھا لیکن رات میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔''میں نے اُٹھ کر اُسے گلے لگالیا۔اُسے کلمہ پڑھایا۔آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک چینی کیلئے عربی الفاظ کی ادائیگی کتنی مشکل ہوگی۔لیکن وہ عجیب سرشاری سے بار بار میرے ساتھ کلمہ طیبہ کے الفاظ دوہرا رہا تھا اور اس کے چہرے پر کئی رنگ بکھر رہے تھے۔اُس کے بعد وہ یونس پول بن گیا۔اب یونس پول چین میں دارالسلام کی کتابوں کی طباعت کے مشن میں مصروف ہے۔بیجنگ سے کوئی ایک ہزار کلو میٹر دور، تبت کے پہاڑوں کی آغوش میں لنجو کے مقام پر ایک اور چینی دارالسلام کیلئے مختلف دینی کتب کے چینی تراجم میں مصروف ہے۔محمد سلیمان حسینی کو اسلام کی تڑپ مدینہ منورہ سے لے آئی تھی جہاں اُس نے مدینہ یونیورسٹی سے کسب فیض کیا اور پھر چین میں دارالسلام کا ''سفیر'' بن گیا۔محمد سلیمان ایک آسودہ حال شخص ہے۔وہ لنجو کے گردو نواح میں 130 مساجد تعمیر کرا چکا ہے اور ''معہد الحرمین'' کے نام سے ایک دینی مدرسہ چلا رہا ہے''۔

عبدالمالک مجاہد نے مجھے نئے منصوبوں کے بارے میں بتایا کہ اس وقت حدیث کی چھ کتابوں صحاح ستہ کے اُردو اور انگریزی تراجم کا کام تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کا اُردو ترجمہ کم و بیش 25 جلدوں میں شائع ہو رہا ہے جبکہ انگریزی ترجمہ 30 جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ترجمے کے ساتھ ساتھ جید علمائے کرام کی ایک ٹیم نے ہر حدیث کے استخراج کے بارے میں بھی بتایا ہے کہ اُس کا پس منظر یا درجہ کیا ہے۔اسی طرح ہر حدیث کی مختصر تشریح و وضاحت بھی موجود ہے۔دارالسلام کی طبع کردہ اٹلس قرآن اور اٹلس سیرت نبوی ﷺ کمال کی چیزیں ہیں۔اب مصر میں شائع شدہ ایک اور نادر اور انتہائی اہم کتاب

''اٹلس فتوحاتِ اسلامیہ'' کے تراجم اور اشاعت کے حقوق حاصل کئے جارہے ہیں۔اس کتاب میں عہد اسلامی کی تمام فتوحات کی تفصیلات و جزئیات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔مصروف مبلغ ڈاکٹر ذاکر نائک نے بھی اپنے لیکچرز کی اشاعت کے حقوق دارالسلام کو دے دیئے ہیں۔اب ان لیکچرز کی اُردو اور انگریزی زبانوں میں ایک سو کے لگ بھگ سی ڈیز تیار کی جا چکی ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی معروف کتاب ''قرآن اور جدید سائنس'' کے اردو، بنگالی اور فلپائنی تراجم شائع ہو چکے ہیں۔''اسلام پر 40 اعتراضات کے عقلی و نقلی جواب'' حال ہی میں طبع ہوئی ہے۔جس میں ڈاکٹر صاحب نے مدلل او رموثر انداز میں ذہنوں میں اٹھنے والے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے۔جلد ہی اُن کے لیکچرز کتابی شکل میں سامنے آرہے ہیں۔

دارالسلام نے جدید فنی و سائنسی ایجادات کو بھی بڑی مہارت سے استعمال کیا ہے'' ڈیجیٹل قرآن'' کمال کی شے ہے۔چھوٹی سی ڈبیا کے چار پانچ بٹن دبا کر آپ کوئی بھی سورہ، کوئی بھی آیت، کئی زبانوں کے ترجمے کے ساتھ سن سکتے ہیں۔بچوں کیلئے الیکٹرانک تعلیمی کھلونوں کا سلسلہ ''بابا سلام'' ساری دنیا میں جگہ بنا چکا ہے۔ایک گھنٹہ دو منٹ کی خوبصورت فلم ''آپ کو کیوں مسلمان ہونا چاہیے؟'' "Why you should be Muslim?" نہایت موثر تبلیغی کشش رکھتی ہے۔

دارالسلام کے مرکزی دفتر سے نکلتے ہوئے میرا دل اس ادارے، عبدالمالک مجاہد اور اُن کے پرعزم رفقائے کار کیلئے دعاؤں سے چھلک رہا تھا۔ (بشکریہ نوائے وقت)

ائیر کموڈور (ر) اعجاز الدین کی خوش دامن لاہور، منظور قادر بھٹہ کی والدہ فیصل آباد، ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قلعہ دیدار سنگھ کے والد صاحب اور ملتان کے بھائی امین شاہ صاحب کے بھائی خادم حسین شاہ صاحب رضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں۔تمام بھائیوں سے مرحومین کیلئے دُعائے مغفرت کی اپیل ہے

انسانی دماغ میں تصور خدا کی دریافت

(ابوالامتیاز ع س۔ مسلم)

''نوائے وقت'' سنڈے ایڈیشن، 3 اگست کے شمارہ میں بعنوان ''سر کسی کا دھڑ کسی کا کیا یہ سائنسی طور پر ممکن ہے''۔ حمزہ صاحب کا ایک جائزہ شائع ہوا ہے، جس میں بندروں کے سر او ر دھڑ کے تبادلے کے تجربات کے علاوہ، انسانی دماغ میں ڈاکٹر چندرن کے ایک God Centre یا تصوراللہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی ڈاکٹر کی اسی موضوع پر ''نیشن'' لاہور، مورخہ 7 نومبر 1997ء میں شائع شدہ ایک رپورٹ پر جناب ابوالامتیاز ع س۔ مسلم نے ایک مفصل مضمون تحریر کیا تھا، جو قارئین کی دلچسپی کیلئے پیش کیا جارہا ہے۔

سان ڈیگو امریکہ کی یونیورسٹی آف کیلیفورنیا کے سائنس دانوں نے انسانی دماغ میں ایک ایسے ''مقیاس'' یا ''پیمانے'' کا سراغ لگایا ہے، جسے انہوں نے گاڈ ماڈیول یعنی نعوذ باللہ ''خدا پیا'' کا نام دیا ہے۔ پیشتر اس کے کہ اس پر خیال آرائی کی جائے خبر کے متن کا مطالعہ ضروری ہے۔

''لندن: سائنس دانوں کو یقین ہے کہ انہوں نے انسانی دماغ میں ایک ایسے ''خدا پیا'' کا سراغ لگا لیا ہے جو انسان کی ارتقاء پذیر جبلت یا فطری بالیدگی کو مذہب پر ایمان کی طرف منعطف کرتا ہے۔ یہ انکشاف سنڈے ٹائمز کی ایک رپورٹ میں کیا گیا ہے''۔

''مرگی کے مریضوں کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ عمیق روحانی تجربات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان پر تحقیق سے دریافت ہوا کہ انسانی دماغ کے اگلے حصے میں ایک دائرہ اعصاب موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کے تصور سے برقی رو کی طرح متحرک ہو جاتا ہے''۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ہر چند یہ تحقیق اور اس کا ماحصل تمہیدی مرحلے میں ہیں، لیکن ابتدائی نتائج سے واضح ہے کہ مذہب پر ایمان کا یہ طبیعی مظہر انسانی دماغ میں مضبوطی سے نصب کر دیا گیا ہے''۔

مرگی کے ان مریضوں نے (جن کے دماغ کی ذہنی لویں گرفت میں آ جاتی ہے) یعنی جن کے دماغ کی پیش لووں پر دورے پڑتے ہیں، کہا کہ انہیں اکثر انتہائی توانا روحانی مشاہدات کا تجربہ ہوتا ہے اور وہ مذہبی روحانی کیفیت میں کھو جاتے ہیں۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی سان ڈیگو،

یو ایس اے کے اعصابی سائنس کے ماہرین کی ایک ٹیم نے کہا کہ سب سے زیادہ حیرت انگیز توضیح یہ ہے کہ وہ دروہ مرگی سے دماغ کے اس شعبے کے اعصاب جسے ''خدا پیا'' کا نام دیا گیا ہے، غیر معمولی طور پر متحرک ہو جاتے ہیں''۔(جس سے انسان ایک روحانی قوت یعنی خدا کا یقین کرنے لگتا ہے۔ع س م)

اس ٹیم نے گذشتہ دنوں ایک کانفرنس میں بیان کیا کہ کن پٹیوں کے اندر دماغی لووں میں ممکنہ طور پر مذہب کے دائرہ کار سے متعلق مخصوص اعصابی نظام مختص ہے اور یہ غالباً معاشرے میں نظم وضبط اور قیام استحکام کیلئے وجود پذیر ہوا ہے''۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے، کوئی خواہ مذہب کو مانتا ہو یا خدا پر ایمان رکھتا ہو، اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ (اس کے) دماغ کے دائرہ اعصاب کا یہ نظام کار کس قدر ترقی یافتہ ہے۔

تحقیقی ٹیم کے سربراہ ڈاکٹر ولایائز رچندرن کا کہنا ہے کہ اس مطالعاتی جائزے میں مرگی زدہ مریضوں کا ایسے عام لوگوں سے موازنہ بھی کیا گیا جن کا کہنا تھا کہ وہ انتہائی مذہب پسند ہیں۔ان کی جلد پر برقی رو پیما لگا دیئے گئے۔جو بطن دماغ میں ذہنی لووں کو ماپنے کا معیاری قاعدہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب مذہبی دعائیہ الفاظ تحریری کی صورت میں ان کے سامنے کئے گئے تو مرگی زدہ اور دوسرے راسخ العقید ہ مذہب پسندوں کی کیفیت اور ردعمل یکساں تھے۔

نظریہ ارتقاء کے علمبردار سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ خدا پر ایمان جو دنیا بھر کے تمام انسانی معاشروں میں مشترک ہے اور تاریخ کے ہر دور میں موجود رہا ہے دماغ کے پیچیدہ دو دقیق دائرہ نظام برقی میں بن دیا گیا ہے جسے ذاروینی تصرف کہہ لیجئے تا کہ اس وحدت تصور سے نوع انسانی کے افراد کے درمیان باہمی ہم آہنگی کی حوصلہ افزائی ہو۔

اگر یہ تحقیق درست ہے کہ انسانی دماغ میں ایک ''خدا پیا'' موجود ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو لوگ وجود حق سے منکر اور دہریے ہیں ان کے دائرہ اعصاب کے نظام کی ترتیب یا ساخت مختلف ہے۔(لیکن یہ تو مخصوص نظری استدلال ہوا، کیا عملی تحقیق نے بھی یہ واقعتاً ثابت کر دیا ہے کہ ان کے اندر ''خدا پیا'' یا اس کا کوئی متبادل موجود نہیں، یا کیا وہ خالی الذہن ہیں؟ع س م)

آکسفورڈ کے بشپ رچرڈ ہیریز کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی "خدا یپا" ہے تو یہ مسئلہ سائنس دانوں کیلئے ہے نہ کہ دینیات کے علماء کیلئے اس نے کہا "اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ اللہ تعالٰی نے ہمیں ایمان کی (روحانی کے علاوہ) طبعی (یعنی مادی) صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔(بشکریہ دی نیشن لاہور 6 نومبر 1997ء)

اس تجزیے میں ڈاکٹر و لایا ئز رچندرن کی سربراہی میں ماہرین اعصاب کی ایک تحقیقاتی ٹیم نے مرگی کے ایسے مریضوں کے مشاہدے اور معائنے کے بعد جو عمیق روحانی تجربوں، سے گزرتے تھے دعویٰ کیا ہے کہ دماغ کے سامنے کے حصے میں ایک ایسا دائرہ اعصابیہ موجود ہے کہ جوں ہی مرگی کا دورہ پڑتا ہے وہ خدا کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔یہ "خدا یپا" دائرہ اعصابیہ برقی رو کی طرح متحرک ہو جاتا ہے اور وہ مذہب کی طرف راغب اور روحانی تجربوں سے دوچار ہونے لگتے ہیں۔

سائنس دانوں نے اس مظہر کی اور تشریحات بھی کی ہیں کہ اس "خدا یپا" کا ارتقا معاشرے میں استحکام اور نظم و ضبط یا دوسرے معنی میں عدل و انصاف قائم کرنے کیلئے ہوا ہوگا۔یا دماغ میں یہ تصرف ڈارون کے نظریے کے مطابق افراد میں باہمی تعاون کے فروغ کیلئے عمل پذیر ہوا ہے، وغیرہ واضح رہے کہ یہ سب امور اخلاق اور ذہن و فکر انسانی سے متعلق ہیں نہ کہ ارتقائے طبعی (جسمانی) سے۔

خدا کا تصور

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کرہ ارض پر موجود تمام انسانوں کی بڑی اکثریت خواہ اس کا تعلق کسی بھی رنگ، نسل، علاقے، معاشرے، مہذب و متمدن یا غیر مہذب و غیر متمدن طبقے سے ہو، یا وہ تاریخ یا زمانہ ماقبل تاریخ کے کسی بھی ادوار سے تعلق رکھتے ہوں، کسی نہ کسی صورت میں ایک قادر مطلق، ایک اللہ اور کسی نہ کسی رنگ میں مذہب یا روحانیت سے گہرا لگاؤ رکھتے رہے ہیں اور اگر جہالت کی گھٹائیں بہت ہی تاریک ہوں تو بھی اپنے جذبہ عبودیت کی تسکین کیلئے مظاہر فطرت آباؤ اجداد یا ان کی تمثیل اصنام میں متبادل تلاش کر لیتے ہیں۔گویا مذہب کی طرف کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالتے ہیں تو کیا اکثریت آدم ہمیشہ مرگی زدہ رہی ہے؟ اور خود سائنس دان

ولایانئر راما چندرن جس معاشرے اور تہذیب کی پیداوار ہیں اس میں تو خیر سے خداؤں اور مذاہب کی اتنی بھر مار ہے کہ شاید شمار سے بھی باہر ہو، کیا ہم ان سب کو مرگی زدہ شمار کریں! طبی تاریخ میں یہ مظہر بھی عام ہے کہ کسی شخص کی یادداشت جو ایک عرصہ سے کھو چکی تھی، ناگہانی صدمے یا جھٹکے سے واپس آ گئی۔ یا جسم کے کسی حصے کی حرکت جو ماؤف ہو چکی تھی، پھر جاری ہو گئی۔ حالانکہ وہ شخص معروف معنی میں مریض، معذور یا مرگی زدہ نہ تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے یعنی یہ مرگی زدگی کا کمال نہیں ہے تو یہ تسلیم کرنے میں کیا عار ہے کہ خدا پرستی یا دوسرے لفظوں میں توحید پرستی اور اس سے اخذ ہونے والے نتائج یعنی ایمان، یقین اور مذہب انسانی جبلت میں داخل ہیں؟ اور یہ ایک مریض کی جبلت نہیں، بلکہ فطرت صالح کی مظہر ہے۔

تاریخ یا وقت کے کسی بھی مرحلے پر دنیا میں مرگی زدہ لوگوں کی فیصد تعداد کیا ہو گی؟ اس کے مقابلے میں اس یا کسی اور علت سے مبرا خدا کے ماننے والوں کی تعداد کیا ہے! پس ثابت ہوا کہ ایک الہ واحد کا تصور ایک صحت مند دماغ کا ناگزیر خاصہ ہے۔ نہ کہ بیمار ذہن کا۔ ضمنی طور پر اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تصور یا احساس حق چونکہ ذہن سے متعلق ہے، اس لئے انسانی شعور کا بھی جو اسے عالم خلقت حیوانی سے ممتاز و ممیّز کرتا ہے تقاضا یہی ہے اور یہی امتیاز باعث شرف بشر ہے۔ جس نے باتفاق مذاہب فرشتوں کو انسان کے سامنے سجدہ ریزی پر مجبور کیا۔

دماغ میں تصور الٰہی کی کیفیت ایسے ہی ہو سکتی ہے جیسے دماغ مادی روح کا وجود یا کسی مرحلے پر قطرہ آب یا منجمد خون میں اس کا حلول، یا جسم میں کسی اور انداز سے ہوا کی طرح تنفس کی موج اور حیات کی نشوونما۔

جب تک روح موجود ہے زندگی قائم ہے روح جسم سے رخصت ہو جائے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ہرگاہ کہ ہمیں اس روح کی حقیقت کا ادراک نہیں لیکن کوئی ایسی لطیف یا غیر مرئی شے جسم انسانی میں کارفرما ہے جو باعث حیات ہے ورنہ جسم تو زندگی اور موت ہر دو صورتوں میں بغیر کمی و بیشی کے موجود ہوتا ہے لیکن زندگی یا حیات کیلئے لازم ہے کہ روح موجود ہو اسی سے ہستی کا اثبات ہے۔

یہ روح کیا ہے؟

ارشادِ ربانی ہے۔

"کہہ دو کہ یہ امرِ ربی یعنی میرے رب کا حکم یا ارادہ ہے (17 بنی اسرائیل 85) یہ لفظ کن ہے جب اللہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے یعنی اسے مقدر کر دیتا ہے۔ تو حکم فرماتا ہے۔ کن یعنی ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ اور یہ لفظ کن بھی دراصل اس کا امر یا ارادہ ہی ہے۔۔۔۔

نوعِ انسانی تمام جستجو کے باوجود کم از کم اب تک روح کی ماہیت کو نہیں سمجھ سکی کیونکہ ایک دوسرے تناظر کے مطابق "اور تم (یعنی نوعِ انسانی) کو علم قلیل ہی دیا گیا ہے"۔

(17 بنی اسرائیل 85)

اس عدمِ دریافت سے یہ لازم نہیں آتا کہ چونکہ جسمِ انسانی میں کوئی روح پیا یا روح کا متعین مقام یا نقش دریافت نہیں ہوا اس لئے اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ روح کا ہمارے جسم کے ساتھ اتنا گہرا تعلق ہونے کے باوجود کہ جس کے ساتھ زندگی اور موت کے رشتے بندھے ہوئے ہیں، ہم ابھی تک نہیں جان پائے کہ یہ مادی ہے تو کہاں ہے اور غیر مرئی ہے تو کہاں سے آتی ہے اور کیسے نکل جاتی ہے اور نہ ہی ہم اس کا تعلق کسی طبیعی مظہر یا روح پیا سے جوڑ سکتے ہیں۔ نہ ہی یہ کسی طرح کسی طبیعی یا ذہنی ارتقائی عمل کا ثمر دکھائی دیتی ہے۔ پھر اسے ایک امرِ ربی، منشائے الٰہی اور ارادہ خالق سمجھ کر قبول کرنے میں کیا امر مانع ہے۔ اگر روح تک جو مخلوق ہے یا اس کے (Module) یا روح پیا تک رسائی حاصل نہیں ہے تو کیا روح کے خالق کے "خدا پیا" کی دریافت خام خیال نہیں!

اور نہیں تو روح کے بارے میں ہم کم از کم اتنا تو جانتے ہیں کہ یہ جسم سے خارج کی ایک لطیف شے ہے جس کا جسم میں وجود احساسِ حیات کی نوید ہے۔

لیکن تصورِ الٰہی، تصورِ حق، تصورِ خالق یا تصورِ خدا کیا ہے! جو ہماری دانست میں ہماری جبلت میں داخل ہے۔ حتیٰ کہ سائنسدانوں کے بقول وہ ہمارے دل میں پیشانی کی جانب ایک خاص مقام پر نقش پذیر ہے۔ یہاں تک کہ وہ کسی خیال، جھلکے کا مشاہدے سے برقی رو کی طرح متحرک ہو کر ہمیں روحانی پرواز پر لے جاتا ہے اور عجیب و غریب تجربات سے دوچار کراتا ہے۔

میثاق ازل

کیا یہ نقش یا مہر ازل کے اس میثاق کا نتیجہ تو نہیں ہے، جب خالق مطلق نے عالم ارواح سے سوال کیا۔

الست بربکم (7۔اعراف۔172) ''کیا میں تمہارا رب نہیں''؟

اور تمام مخلوق نے بیک زبان تسلیم کیا۔

قالوا بلی (7اعراف۔172) ''بے شک آپ ہمارے رب ہیں''۔

پھر جب اللہ نے آدم کی شکل میں حیات عطا کی، تو ان کی رہنمائی، ہدایت، کردار سازی اور باہمی معاملات اور ہم آہنگی کیلئے پیغمبران کرام اور ان کے ذریعے ہدایت کے تمام ذرائع یعنی کتب بھیجیں، تا کہ معاشرے میں انصاف، عدل، استحکام اور نظم وضبط قائم رہے۔ کیا یہ وہی میثاق ازل نہیں ہے جسے سائنسدان اب مرگی زدگان، کے دماغ میں دریافت کر رہے ہیں؟ یا یہ خدا بیائی کا اعصابی دائرہ ہے جس کے متحرک ہونے پر ہی خدا کا احساس ہو۔ ظاہر ہے کہ صورت واقع تو یہی ہے کہ اس میثاق کو مہر اللہ نے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہمارے دل و دماغ اور فطرت پر ثبت کر دی ہے، لیکن کج خیال اور کج نظر لوگ اس سیدھی سادی حقیقت کی توضیح بھی اپنی کج روی کی طرح کج دلیلوں سے کرتے ہیں۔

ہم خواب دیکھتے ہیں۔ بڑے بڑے صحت مند لوگ، قوموں کے سردار، ماہرین علوم، سائنسدان اور بادشاہ تک خواب دیکھتے ہیں اور عالم خواب میں وہ سب نہ صرف اپنے خیالات کو مجسم دیکھتے ہیں بلکہ اگر آگ دیکھی تو اس کی تپش، چوٹ کا درد، جنگ کی گھن گرج وغیرہ غرض یہ کہ ہر چیز محسوس کرتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کا خواب سب سے زیادہ مشہور رہا جو کہ تمام مذاہب کو تسلیم ہے۔ بعض خوابوں کا اثر تاعمر محسوس ہوتا ہے۔ ایسے خوابوں کی بھی کمی نہیں جو سچ ثابت ہوئے اور انہوں نے قوموں کی تاریخ بدل دی۔ راقم الحروف خود حالت خواب میں متعدد ایسے تجربات سے دوچار ہو چکا ہے، جو بعد میں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئے۔ اگر خیال کا خواب میں مجسم ہو کر سامنے آ جانا مرگی زدگی نہیں تو ایک اللہ واحد کا جاگتے میں تصور اور اس کے نتائج کا انسانی کردار میں عمل پذیر ہونا کیسے غیر صحت مند ہو گیا۔

ایک قادر مطلق اور الٰہ واحد میں ایمان اور روحانی تجربات کو بیماری سے منسلک کرنے کا یہ پہلا واقع نہیں ہے۔ رسول کریم ﷺ پر بھی کہانت، جادوگری اور جنون (نعوذ باللہ) کی تہمت طرازی کی گئی تھی اور تاریخ میں جتنے جلیل القدر پیغمبر گزرے ہیں، انہیں بھی ایسے الزامات کا ہدف بننا پڑا۔ سائنسدانوں کی اس تھیم کو انسانی دماغ کی اس ساخت کا جواز قدرت خداوندی اور رحمت الٰہی میں ڈھونڈنا چاہئے۔ جس نے انسان کو پیدا کر کے اس سے میثاق لے کر اور اپنے بندوں کیلئے اس میثاق کی پابندی کو آسان کرنے کیلئے انبیاء کرام بھیج کر اور خود دماغ انسانی میں اس میثاق کی پاسداری کا اہتمام کر کے ان پر احسان عظیم فرمایا تا کہ معاشرے میں اعتدال اور عدل و انصاف قائم رہے۔ واضح رہے کہ یہاں خدا یا کی حقیقت یا عدم حقیقت پر نہیں بلکہ اسکی توجیہ مرگی زدگی پر اعتراض مقصود ہے۔

رہ گئے مرگی زدہ لوگوں کے تجربات تو اس کی توضیح کے اور جواز الگ ڈھونڈنے ہوں گے۔ دنیا میں اس وقت ایسے بھی مرگی زدہ ہیں جو باوجود یکہ جسمانی صلاحیتوں سے محروم ہیں، لیکن مثال کے طور پر علم طبیعات (PHYSICS) میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مرگی کے جھٹکے یا دورے بعض ایسے اعصاب کو متحرک کر دیتے ہیں جن میں بشمول خدا پرستی اور مذہب پرستی اور بھی کچھ صلاحیتیں ہوں جو عارضی طور پر ظاہر ہو جاتی ہوں، لیکن خدا پرستی اور مذہب سے لگاؤ کو مرگی کا نتیجہ قرار دینا خود مرگی زدہ ہونے کی علامت تو ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

چند مشاہدات

یہاں راقم الحروف کے چند اپنے مشاہدات نقل کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

1961ء میں اپنے دورہ ناروے کے دوران میں میں ذہنی پسماندگان کے ایک ادارے میں تربیت اور مشاہدے کیلئے چند روز کیلئے قیام پذیر تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک ایسے ذہنی پسماندہ نوجوان سے ہوئی جس کی عمر 18,17 سال تھی۔ اس کا مقیاس ذہن I.Q پچاس سے بھی کم تھا۔ وہ صرف چند لفظ بول سکتا اور شاید بمشکل پندرہ تک گن سکتا تھا اور اس کی رال ہر وقت ٹپکتی رہتی تھی۔ اس کی بقیہ زندگی کا اندازہ ایک ڈیڑھ برس سے زیادہ نہ تھا۔ وہ کوئی کام سیکھنے یا پڑھنے کا اہل نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک حیرت انگیز صلاحیت بخش رکھی تھی۔ آپ کوئی بھی تاریخ، مہینہ اور سن بتا کر اس سے متعلق دن دریافت کریں خواہ وہ پانچ سال قبل کا ہو، پچاس سال قبل کا یا

اور زیادہ، قدیم، وہ صحیح دن بتا دیتا حالانکہ اس کو بولنے میں بھی خاصی دقت ہوتی تھی۔ میں نے اپنے سفر اور بچوں کی پیدائش کی تاریخیں بتا کر اس کا امتحان لیا اور وہ ہر بار پورا اترا۔ یہ لڑکا مرگی کا مریض نہیں تھا۔

سن 60ء اور 70 عیسوی کی دہائی میں کراچی پاکستان میں سندھ گورنمنٹ کے پریس مینیجر جی اے مجددی کا پندرہ سولہ سالہ ذہنی پسماندہ بیٹا جسے پیار سے مولوی صاحب پکارا جاتا تھا اور کسی سکول میں داخل ہونے کے قابل نہ تھا۔ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات اور حادثات کے بارے میں پیش گوئی کر دیتا تھا۔ جو اکثر اوقات درست ثابت ہوتی۔ میری مجددی صاحب سے ملاقات گاہے بگاہے اپنے برادر نسبتی ڈاکٹر جی ایم مہکری مرحوم کے ہاں ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن اس نے مجددی صاحب کے ایک دوست کو جو میلوں دور سے انہیں ملنے آتا تھا دیکھ کر کہا کہ آگ لگی ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت کی وجہ سے کسی نے توجہ نہ دی لیکن جب وہ شخص واپس گھر پہنچا تو دیکھا گھر یا گیراج میں واقعی آگ لگی ہوئی تھی جو خاصے نقصان کا باعث ہوئی تھی۔

اِسی لڑکے کا دوسرا واقعہ مشہور جرنلسٹ اور پاکستان ٹیکسٹائل جرنل کے مدیر مظہر یوسف صاحب نے مجھ سے بیان کیا۔ جولائی 1977ء کے ابتدائی دنوں میں وہ اور ڈاکٹر جی ایم مہکری بہ سلسلہ ملاقات مجددی صاحب کے گھر گئے جہاں انہیں مغرب کا وقت ہو گیا۔ مجددی صاحب نے صحن میں کرسیاں لگوا دیں جہاں یہ لوگ بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے۔ موضوع گفتگو ذوالفقار علی بھٹو تھے جن کے خلاف پی ایم اے کی سرگرم تحریک جاری تھی۔ ایک کرسی کم تھی اور مولوی صاحب اچانک آ کر ڈاکٹر مہکری کی گود میں بیٹھ گئے۔ اتنے بڑے ذہنی پسماندہ لڑکے سے بھی یہ امر غیر متوقع تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر اسے پرے دھکیل دیا۔ اتنی دیر میں چائے آ گئی اس لڑکے نے چائے کی پیالی مہکری صاحب کے ہاتھ سے چھین لی۔ صورتحال خراب دیکھ کر مجددی صاحب نے کہا ''ڈاکٹر! خوش ہو جاؤ، تمہارے دلدر دور ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کو لڑکے کی ذہنی کیفیت اور غیر معمولی صلاحیت یاد آ گئی اور انہوں نے تاسف کا اظہار کیا۔ مجددی صاحب نے بیٹے کو اشارہ کر کے کہا ''جاؤ کرسی لے آؤ'' اس نے فوری طور پر جواب دیا ''اُلٹ گئی، اُلٹ گئی، کرسی اُلٹ گئی'' اسی رات بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ یہ لڑکا بھی مرگی زدہ نہیں تھا۔ (جاری)

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی انفرادیت

1۔ دوسرے سلسلوں کی روحانی معراج اور آخری منزل کشف وکرامات کا حصول ہے لیکن ہمارے سلسلہ میں اُنکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے سلسلہ کا آخری مقصد اللہ کا قرب، عرفان اور لقاء کا حصول ہے۔

2۔ بزرگان عظام اور اولیائے کرام کی کرامات برحق اور انکی دعاؤں کی مقبولیت مسلم لیکن ہم مشکل کشاء اور حاجت رواصرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو مانتے ہیں۔

3۔ موجودہ دور کی مصروف زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے مختصر اور سہل اوراد واذکار تلقین کیئے جاتے ہیں۔

4۔ ہمارے سلسلہ میں مجاہدہ کیلئے غصہ اور نفرت کو مکمل طور پر نفی کرنے اور عالمگیر محبت اور صداقت کو اختیار کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے۔ یہ تربیت گھر کی چاردیواری کے اندر احسن طریقے سے ہوسکتی ہے۔

5۔ بانی سلسلہ توحیدیہ کے وصیت نامہ کے مطابق سلسلہ توحیدیہ کے روحانی پیشوا کا منصب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غیر وارثتی ہوگا۔

6۔ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی تعلیم مذہبی گروہ بندیوں اور فرقہ واریت سے بالاتر اور وسعت قلب ونظر کی مظہر ہے۔

7۔ ہمارے سلسلہ میں مریدوں کی تعداد بڑھانے کیلئے اندھا دھند بیعت نہیں کیا جاتا ہر شخص کو بیعت کرنے سے پہلے کم از کم چھ ماہ طالب رکھا جاتا ہے تاکہ وہ جماعت کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہو کر داخل سلسلہ ہو۔

8۔ سلسلہ توحیدیہ میں متوازی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جس میں نہ تو دنیا کو ترک کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی اس میں غرق ہو جانے کی۔

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف

قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔
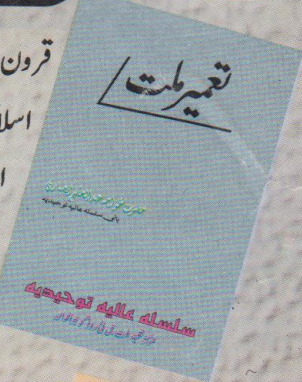
کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔

سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔

زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔

تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔
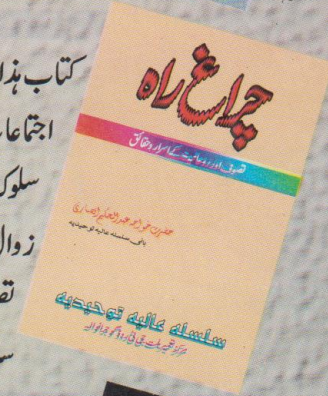
یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔ مصنفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کر دیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقا اور ترقی کیلئے دین کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔

Website: www.toheedia.net